قرآن و حدیث کے متعلق اردو زبان کا پہلا سہ ماہی مجلہ محکمہ

کتاب و سنت

جولائی - ستمبر 2025

قرآن وحدیث کے متعلق اردو زبان کا پہلا سہ ماہی مجلہ محکمہ

کتاب وسنّت

جلد-01 جولائی-ستمبر 2025 شمارہ-03

مدیر

شاہ اجمل فاروق ندوی

معاونین

عبداللہ شیرازی، محمد عمران

خط و کتابت کا پتہ

KITABOSUNNAT QUARTERLY
G-5/A, Abul Fazl Enclave,
Jamia Nagar, New Delhi - 110025
Email: info@kitabosunnat.in
+91-9873298015 I +91-9654058854

غزل

امیر خسروؔ دہلوی

اے چہرۂ زیبائے تو رشک بتان آزری ہر چند وصفت می کنم درحسن زاں بالانہٗ

(اے کہ تیرا چہرہ بتان آزری کے لیے نا قابل رشک ہے، تیری جتنی بھی تعریف کروں تو اس سے بڑھ کر حسین ہے)

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

(میں نے آفاق کی سیر کی ہے، بہت حسینوں کو دیکھا ہے لیکن تو دوسری چیز ہے)

تو از پری چابک تری وز برگ گل نازک تری وز ہرچہ گویم بہتری حقا عجائب دلبری

(تو پری سے زیادہ سبک، برگ گل سے زیادہ نازک ہے، جو کچھ بھی کہوں تو یقیناً اس سے بہتر اور عجیب دلبر ہے)

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

(میں تو ہو گیا، تو میں ہو گیا، میں تن ہوا تو جاں ہوا۔ اب کوئی یہ نہ کہے کہ میں الگ ہوں تو الگ ہے)

خسروؔ غریب است و گدا افتادہ در شہر شما باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

(خسرو تمہارے شہر میں اجنبی اور گدا بن کر پڑا ہے، خدا کے واسطے اجنبیوں پر بھی ایک نظر کرو)

فہرست

اداریہ		
حسنِ انجام اور قرآن وحدیث	شاہ اجمل فاروق ندوی	07
قرآن اور صاحب قرآن		09-60
قرآن کی تصویر، قرآن کی زبانی	پروفیسر سیّد ابوالخیر کشفی	11
قرآن میں ناسخ ومنسوخ کی تحقیق	مولانا سید محمد یوسف بنوری	27
ارتقائی استشراقی نظریات کا مطالعہ مغرب کی تصدیق وحی ونبوت محمد ﷺ	صائمہ شہباز منج محمد شہباز منج	31
سنت اور صاحب سنت		61-102
حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات حدیث	مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی	63
یحییٰ دمشقی: اولین عیسائی سیرت نگار	پروفیسر عبدالرحیم قدوائی	81
مستشرقین کا تیار کردہ اشاریہ حدیث	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	87
متفرقات		103-108
دار المعارف الاسلامیہ، الہ آباد کی لائبریری	شاہ اجمل فاروق ندوی	105

حسنِ انجام اور قرآن وحدیث

مشہور انگریزی مصنف روبن شرمانے ایک سوال اٹھایا ہے:

A gun would be too violent. A noose would be too ancient. And a knife blade to the wrist would be too silent. So, the question became, How could a once-glorious life be ended swiftly and precisely, with minimum mess yet maximum impact?

(Robin Sharma, The 5 AM Club, Jaico Publishing House, Mumbai, 2018.page 1.)

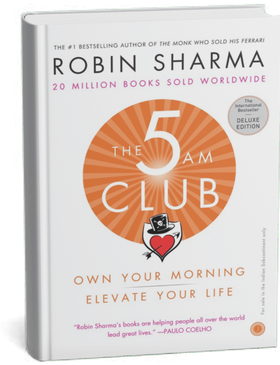

ایک بندوق بہت پرتشدد ہوسکتی ہے۔ایک پھانسی کا پھندہ بڑا پرانا ہوسکتا ہے۔کلائی تک پہنچنے والا ایک چاقو نہایت خاموش ہوسکتا ہے۔اب سوال یہ ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ عطا ہونے والی زندگی کے پرسکون اور شاندار خاتمے کو کم سے کم نقصان اور زیادہ سے زیادہ تاثیر کے ساتھ کس طرح یقینی بنایا جاسکتا ہے؟

آج کی دنیا میں مادیت کے پیچھے دن رات دوڑنے والا انسان بھی کبھی نہ کبھی اس طرح کے سوالات پر غوروفکر کرہی لیتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ صنعتی انقلاب نے انسان کی زندگی پرسکون بھی بنائی ہے اور پرخطر بھی۔مادی ترقیوں سے دور فطری زندگی گزارنے والا انسان بہت سی مشقتیں برداشت کرتا تھا،لیکن اسی پچاسی سال جیتا تھا۔آج کا انسان سہولتوں سے بھری ہوئی زندگی تو گزارتا ہے لیکن پچاس پچپن سال میں بوریا بستر البیٹ لیتا ہے۔اس صورتِ حال نے بھی انسان کو مذکورہ سوال کی طرف متوجہ کیا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو یہ سوال نیا نہیں ہے۔ہر دور میں انسان کے ذہن میں اس طرح کے سوالات اُٹھتے رہے ہیں۔مصر، یونان، ہندستان، چین اور عرب کے شاید ہر فلسفی نے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔آج کے فلاسفہ و مصلحین بھی اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کررہے ہیں۔ یہ سوالات کچھ لوگوں کی مذہب بےزاری کا ذریعہ بنے ہیں، تو بے شمار لوگوں کی مذہب سے وابستگی انھیں سوالات کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔

چھٹی صدی عیسوی میں عرب کے مطلع سے طلوع ہونے والے آفتابِ ہدایت نے بھی دنیا کو اس سوال کا جواب سمجھایا۔ایسا سمجھایا کہ ماضی کے فلاسفہ کے نظریات بھی فضول لگنے لگے اور عہدِ جدید کے پڑھے لکھوں کی بحثیں بھی لن ترانی لگنے لگیں۔اللہ کے آخری نبی حضرت محمد مصطفی ﷺ جو کتاب لائے اور اپنے قول وعمل سے اس کی جو تشریحات بیان کیں، ان میں انسانی زندگی کے ہر سوال کا جواب اور ہر مشکل کا حل بتادیا گیا ہے۔

یہاں اس کا موقع نہیں کہ مذکورہ سوال اور اس کے قرآنی یا نبوی نکات پر سیر حاصل گفتگو کی جائے البتہ ایک بنیادی نکتے پر توجہ دلائی جاتی ہے۔ یہ نکتہ ایک اصول، ایک کلیہ اور ایک نسخہ (Formula) ہے۔ اس سے لاتعداد شاخیں پھوٹتی ہیں۔

قرآن وحدیث کی تعلیمات کا اعتقادی محور توحید اور عملی محور تقویٰ ہے۔ ان دونوں میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ ایک عقیدے کی چیز ہے اور دوسری کردار کی۔ ورنہ یہ دونوں ہیں ایک ہی۔ ہم انھیں لازم وملزوم بھی کہہ سکتے ہیں۔ انسان اپنا مقصود ومنتہا صرف ایک ذات کو بنائے، اپنے دل میں صرف اسی کو بسائے اور زندگی کے ہر کام میں اسی کی پسند ناپسند کا خیال رکھے۔ ایسے انسان کا آغاز بھی اچھا ہوگا اور انجام بھی۔ اس کا اندرون بھی چمکے گا اور بیرون بھی۔ یہ شخص اپنے جسم کی کائنات کو بھی کامیابی کے ساتھ منزل تک پہنچائے گا اور خارجی نظام کائنات کو بھی۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابل لحاظ ہے کہ اسلام میں زندگی اور موت ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔ مزید یہ کہ یہاں آغاز وانجام کا ہر معاملہ قادرِ مطلق کے ہاتھ میں ہے۔ یہاں کسی غاصب کو مرنے کے بعد پوجا ارچنا کرکے موکش پراپت نہیں ہوسکتا۔ یہاں ایسا کوئی تنتر منتر نہیں ہے جس کا زبانی جاپ بدکردار کو باکردار اور عمر بھر کے ناکام کو مرتے وقت کامیاب کردے۔ یہاں عقیدے کے ساتھ عمل اور عمل کے ساتھ عقیدہ ایسا گندھا ہوا ہے کہ اسے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں زندگی بھر کے اعمال کا مدار اچھی نیتوں پر اور اچھے خاتمے پر ہے۔ نجاتِ اخروی کا خواہش مند انسان جتنی جلدی نجات کے اس فارمولے کو سمجھ لے گا، اس کے لیے اتنا ہی اچھا ہوگا۔

شاہ اجمل فاروق ندوی

قرآن اور صاحب قرآن

قرآن کی تصویر، قرآن کی زبانی

پروفیسر سیّد ابوالخیر کشفی

قرآنِ حکیم کتابِ عجائب الغرائب ہے۔ یہ ایک ایسی دنیا ہے جس کے اسرار و رموز ہر دور میں انسانوں کے سامنے نئے انداز سے اُبھرتے آئے ہیں اور یوں ہی اُبھرتے رہیں گے۔ ہمارے علم کی سطح جیسے جیسے بلند ہوتی جاتی ہے، کائنات پر ہمارا عمل تسخیر جس درجہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے، قرآن اپنے معارف کو اسی نسبت سے آشکار کرتا جاتا ہے۔

”انسانوں نے اس کتابِ عظیم کے بارے میں ہر دور میں جو کچھ کہا ہے وہ اسی لیے مختلف ہے۔ ہم زمان و مکان کے دائرے میں رہ کر سوچ سکتے ہیں۔ اسی لیے قرآن کی تفسیر، اس کی تعلیمات اور اس کے مطالعے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ ہم قرآن کی صفات اور خصوصیات کو اس کی اپنی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ کوشش ہماری تمام ذاتی کوششوں کی نسبت حقائق سے قریب تر ہوگی۔“

انسانوں نے اس کتابِ عظیم کے بارے میں ہر دور میں جو کچھ کہا ہے وہ اسی لیے مختلف ہے۔ ہم زمان و مکان کے دائرے میں رہ کر سوچ سکتے ہیں۔ اسی لیے قرآن کی تفسیر، اس کی تعلیمات اور اس کے مطالعے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ ہم قرآن کی صفات اور خصوصیات کو اس کی اپنی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ کوشش ہماری تمام ذاتی کوششوں کی نسبت حقائق سے قریب تر ہوگی۔ ”قرآن اپنی تفسیر آپ ہے“ اس جملے کو پھیلایئے تو ایک طرف یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ قرآن کی تعلیمات نہایت واضح ہیں، اور دوسری طرف اپنی تفسیر آپ ہونے کا یہ مفہوم بھی واضح ہو جائے گا کہ قرآن کی نوعیت، اس کے دائرے اور احاطے کی وسعت، اس کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں کا تعارف، اسی کتاب کے وسیلے اور مدد سے ممکن ہے۔

اس مطالعے میں کوشش یہ کی گئی ہے کہ اس کتاب کی اہم صفات جس ترتیب سے اس میں آئی ہیں اسی ترتیب سے پیش کی جائیں:

کتاب

قرآنِ کریم کے آغاز ہی میں ہمیں اس کا یہ تعارف ملتا ہے:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ. هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (البقرۃ: ۲)

اس کتاب میں کوئی شک نہیں۔ یہ متقیوں کے لیے رہنما ہے۔

کتاب کے لفظ کے ساتھ ہی پہلا تصور جو ہمارے ذہنوں میں اُبھرتا ہے وہ ایک مرتب چیز کا ہے، منتشر اوراق کو کتاب نہیں کہا

جاسکتا۔قرآن نے کئی مقامات پر اپنے آپ کو ’کتاب‘ کہا ہے۔اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحیِ ربانی کی روشنی میں مرتب فرمایا اور ایک مرتب و منظم شکل میں انسانیت کو عطا فرما کر تکمیل فریضۂ نبوت و رسالت فرمائی۔

قرآنِ کریم کی سورتوں اور آیتوں پر ہی غور کیجیے تو اس کی ترتیبِ محکم واضح ہو جائے گی۔رہی بات تکرار کی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اہم احکام کی وضاحت مختلف صورتِ حال (situations) کے تحت کی گئی ہے، یا اہمیت کو اُبھارنے کے لیے بعض احکام کو دُہرایا گیا ہے یا تصریف ِآیات کا مقصد خالص نفسیاتی اور تعلیمی ہے کہ مختلف انداز یا ایک ہی انداز سے ایک بات کو وقفے وقفے کے ساتھ یوں دُہرایا جائے تاکہ وہ بات کے مرحلے سے گزر کر ’مسلکِ حیات‘ کا اشارہ اور قرینہ بن سکے۔

’کتاب‘ کے اس عام اور مروجہ مفہوم سے آگے بڑھیے تو عربی زبان کی رُو سے کتاب کے اور بھی کئی معانی سامنے آتے ہیں۔کتاب مجموعۂ قوانین کو بھی کہا جاسکتا ہے، بلکہ وہ کتاب جو احکام و قوانین کا مجموعہ ہو، اسے ہی الکتاب کہنا زیب دیتا ہے۔اس معانی کو قرآنی آیات کی روشنی میں پرکھا جاسکتا ہے، مثلاً کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کا مطلب یہی ہوا کہ تم پر روزے فرض کیے گئے۔قرآن کے باب میں کتاب کے انھی معانی کی وضاحت سورۂ نساء کی اس آیت سے ہوتی ہے:

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىکَ اللّٰہُ (النساء: ۱۰۵)

(اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تم پر یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے تاکہ تم اللہ کی ہدایات کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو۔

شک و شبہہ سے بالاتر

کتاب کے معنوں کی اس وضاحت کے بعد ہم قرآنِ حکیم میں قرآن کے پہلے تعارف کی طرف لوٹتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ یہ ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شک وشبہہ نہیں، اور جو متقیوں کے لیے ہدایت ہے۔اس کتاب میں شک اس لیے نہیں کہ یہ خدائے علیم وخبیر کی نازل کی ہوئی ہے۔قرآن نے تنزیل کے لفظ سے یہ بات واضح کر دی ہے کہ وحی ایک خارجی شے ہے اور نبیؐ کے ذہن کی پیداوار نہیں۔چودہ صدیاں اس حقیقت پر گواہی دے رہی ہیں کہ اس کتاب میں کل شک تھا، نہ آج شک ہے (اور نہ کل ہوگا)۔آج علوم کی تیز رفتاری کا عالم یہ ہے کہ بعض کتابیں چھپنے کے دوران ہی پرانی ہو جاتی ہیں لیکن وحی الٰہی کے حقائق اتنے محکم ہیں کہ چودہ صدیوں نے انھیں اور اُبھار دیا ہے۔

ھُدٰی

اِس کتابِ محکم نے اپنے تعارف میں اپنے آپ کو ھُدٰی کہا ہے۔ہم نے اس کا ترجمہ ’رہنما‘ لکھا ہے۔یہ ترجمہ مولانا فتح محمد جالندھری اور دوسرے مترجمین کے یہاں بھی ملتا ہے اور اس لفظ کے لغوی معنوں پر دلالت کرتا ہے۔

ھُدٰی کے معنی ہیں راستہ دکھانے کے لیے آگے آگے چلنا۔زندگی کی تاریک راہوں کو ہمارے لیے قرآن نے اسی طرح روشن کیا ہے۔اس لفظ کے بنیادی معنوں میں رہنمائی کے ساتھ ساتھ روشنی کا مفہوم بھی موجود ہے۔وہ چیز جو روشن ہو (اور جس کی روشنی

میں دوسری اشیا بھی صاف نظر آئیں)ھُدٰی ہے، جیسے دن۔قرآن کی اس روشنی کا نتیجہ ہے کہ اس کے بتائے ہوئے حقائق کے بارے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا لیکن قرآن کی یہ رہنمائی، یہ ہدایت اور روشنی، متقی لوگوں کے لیے ہے۔

لفظ متقی کا ترجمہ 'ڈرنے والے' مکمل نہیں۔تقویٰ قرآن کی ایک نہایت جامع اصطلاح ہے اور اُردو میں اسے قبولِ عام حاصل

> حضرت موسیٰؑ کے عہد میں ایک طرف فرعون، قارون اور ہامان کی مشترکہ قوتیں باطل کے آستانے پر انسانیت کے سر کو جھکانا چاہتی تھیں، اور دوسری طرف موسیٰ کے ذریعے خدا حق کو آشکار کر رہا تھا۔قرآنِ کریم نے توریت کو بھی فرقان کہا ہے۔اسی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وحی الٰہی ہر زمانے میں فرقان رہی ہے۔

ہے، اسی لیے کسی دوسرے لفظ کے سہارے کی ضرورت نہیں۔قرآن میں اکثر مقامات پر تقویٰ کے ساتھ اللہ کا ذکر ضرور ہے۔اس سے قرآنی تقویٰ کی وضاحت خود بخود ہو جاتی ہے۔متقی وہ لوگ ہیں جو اللہ کی حفاظت اور نگہداشت کے متمنی ہیں، جو ہر اس چیز سے احتیاط اور اجتناب برتتے ہیں جو احکامِ الٰہی کے مطابق نہ ہو۔متقی اپنی زندگی کا ہر لمحہ اللہ کے احکام کے مطابق بسر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں اسوۂ حسنہ کو نمونے کے طور پر اپنے سامنے رکھتا ہے۔متقی احکامِ الٰہی سے پیوست رہتا ہے اور فاجر (متقی کی ضد) وہ ہے جو راستے سے علاحدہ ہو جائے۔

فرقان

یہ کتاب جس میں کوئی شک نہیں اور جو متقیوں کی رہنمائی کرتی ہے، ان حقائق کا مجموعہ ہے جو اس سے پہلے دوسری آسمانی کتابوں میں پیش کیے گئے تھے، اور جن کو وقت گزر جانے کے ساتھ ان مذاہب کے متبعین نے مسخ کر دیا تھا، یا چھپا دیا تھا۔اس کتاب کے ذریعے وہی حقائق واضح طور پر انسانوں کے سامنے آگئے۔یہ وہ مجموعۂ قوانین ہے جس نے تمام چھپی ہوئی حقیقتوں کو اس طرح بیان کر دیا کہ حق و باطل الگ الگ ہو گئے۔یہ وہ حقائق ہیں جن کا احاطہ انسان کی عقل نہیں کر سکتی تھی۔قرآن نے اپنے حقائق کو 'بیّنات' کہا ہے:

> شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَ الْفُرْقَانِ ج (البقرۃ:۱۸۵)
>
> وہ رمضان ہی کا مہینہ ہے جس میں (اوّل اوّل) قرآن نازل ہوا، جو لوگوں کا رہنما ہے اور جس میں ہدایت ہے، کھلی ہوئی نشانیاں (بینات) ہیں اور فرقان ہے۔

'مبین' اور 'بیّنات' کے بیان کردہ مفہوم سے بیّنات کی وضاحت اس کے مروجہ ترجمے، یعنی 'ہدایت کی کھلی ہوئی نشانیاں' کی نسبت زیادہ بہتر طور پر ہو جاتی ہے۔'فرقان' کے لفظ میں بھی مبین کے معنی کسی حد تک موجود ہیں۔فرقان الگ الگ کر دینے والے کو کہتے ہیں۔یہ وہ کتاب ہے جس نے حق و باطل کو ہمیشہ کے لیے الگ الگ کر دیا۔اس کے لیے ضروری تھا کہ یہ کتاب 'مبین' بھی ہوتی۔اللہ

کی وحی ہر دور میں فرقان رہی ہے۔حضرت موسیٰ کے عہد میں ایک طرف فرعون، قارون اور ہامان کی مشترکہ قوتیں باطل کے آستانے پر انسانیت کے سر کو جھکانا چاہتی تھیں، اور دوسری طرف موسیٰ کے ذریعے خدا حق کو آشکار کر رہا تھا۔قرآنِ کریم نے توریت کو بھی فرقان کہا ہے۔اسی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وحی الٰہی ہر زمانے میں فرقان رہی ہے۔

مبین و مصدّق

قرآنِ حکیم نے صحفِ اولیٰ کی بنیادی تعلیمات کو اپنے دامن میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔قرآن کی اس خصوصیت کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے اسے کتابِ مبین اور مصدق قرار دیا ہے۔یہ کتاب تورات اور دوسرے صحف کی مصدق ہے۔

فَاِنَّہٗ نَزَّلَہٗ عَلٰی قَلْبِکَ بِاِذْنِ اللّٰہِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ (البقرۃ:۹۷)

اس (جبرئیلؑ) نے تو یہ کتاب اللہ کے حکم سے تمھارے دل پر نازل کی ہے، جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔

اللہ نے ہمیشہ انسانوں کو فسانہ وفسوں کی بھول بھلیوں سے بچانے کے لیے اپنے انبیا کے ذریعے وحی کی صورت میں حقائق کے تحفوں سے سرفراز فرمایا ہے۔انسانوں نے ان حقائق کو فسانہ وفسوں کے رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کی لیکن قرآنِ حکیم نے ان کوششوں کے سلسلے کو ہمیشہ کے لیے ناکام و نامراد بنا دیا اور وہ اس طرح کہ قرآن کے دامن میں صحف ِاولیٰ کے حقائق بھی جگمگا رہے ہیں۔اس سے یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ وہ حقائق جن میں کوئی شک نہیں اور جو رہنمائی کرتے ہیں وہ اَبدی ہیں۔۔۔۔وقت اور زمانے سے بلندتر!

مصدّق کے معنی ہیں تصدیق کرنے والا اور سچ کر دکھانے والا۔سچ کر دکھانے کے لیے قوت ایک بنیادی عنصر کا درجہ رکھتی ہے۔قرآن نے تعلیماتِ الٰہی اور انسانی زندگی کی بنیادی اقدار کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کے وسیلے سے سچ کر دکھایا۔

قرآن اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے، وہ کتابیں جن میں انسانوں کی مختلف جماعتوں اور اَدوار کے لیے اللہ تعالیٰ کی وحی موجود تھی۔وحی الٰہی کا مقصد انسانوں کی رہنمائی ہے۔رہنمائی کا تعلق اعمال سے ہے۔تمام صحف ِسماوی اور قرآن میں اچھے اعمال کے لیے بشارت دی گئی ہے اور بُرے اعمال کے نتیجے سے ڈرایا گیا ہے (یہ کام نبی اکرمؐ کے وسیلے سے ہوا، اسی پر حضوؐر کو بشیر ونذیر کہا گیا)۔

بُشریٰ

قرآن کو اللہ تعالیٰ نے بُشریٰ یعنی خوش خبری اور بشارت کا نام بھی دیا ہے۔چنانچہ کہا:

وَ بُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ (البقرۃ:۹۷)

اور خوش خبری سنا رہا ہے ایمان والوں کو۔

قرآن ہمیں بشارت دیتا ہے کہ اچھے اعمال کا نتیجہ دونوں جہانوں کی سرفرازی ہے، ہمیشگی کی زندگی اور جنّت ہے۔یہ بشارت

ہمارے لیے مہمیز اور قوتِ محرکہ کا کام دیتی ہے۔قرآن کی آیاتِ کریمہ مبشرات ہیں۔ایسی ہوائیں جو رحمت اور بشارت کے بادلوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے آتی ہیں۔

نُزولِ بالحق

وہ کتاب جس میں شک نہ ہو، جو ایسے حقائق سے عبارت ہو جو ظن و گمان کی اس دنیا میں کبھی نہیں بدلتے، جو دوسری کتابوں کی مصدق ہو، جو حق و باطل کو الگ الگ کرتی ہو، اس کے بارے میں اس کے بھیجنے والے کا یہ کہنا ان خصوصیات کو سمیٹ لینے کے لیے ہے کہ:

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ نَزَّلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ (البقرۃ:۱۷۶)

اللہ نے یہ کتاب حق کے ساتھ نازل فرمائی ہے۔

حق زمانے کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتا، بلکہ زمانے کے تقاضے اس کا ساتھ دیتے ہیں۔کیوں کہ حق صاحب حِکمت بھی ہے اور صاحب تخلیق و ایجاد بھی۔اللہ اسی لیے حق ہے اور رسول و قرآن بھی اسی مفہوم کے اعتبار سے حق ہیں۔حق کا مقابل لفظ ’ظن‘ ہے جس طرح اسلام و کفر۔

حق کے ساتھ نازل کرنے کا منطقی اور لازمی تعلق مصدّق کے ساتھ ہے۔اُسی کتاب کو ہم حق کہہ سکتے ہیں جس کی تمام تعلیمات وقت کی گردشوں پر غالب آئیں اور جس کے دامن میں وہ ربانی تعلیمات محفوظ ہوں جو ابتدائے کائنات اور آغازِ وحی سے زمانہ نزولِ قرآن تک انسانی زندگی کی شیرازہ بندی کرتی رہی تھیں:

نَزَّلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ وَ اَنْزَلَ التَّوْرٰۃَ وَ الْاِنْجِیْلَ (آل عمران:۳)

اس نے (اے محمد ﷺ) آپؐ پر سچی کتاب نازل کی جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اسی نے توریت اور انجیل نازل کی۔

حق کے سلسلے میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حق میں دو عناصر ہیں: ۱-صحت، ۲-پایداری۔ ثبات و دوام صحت کے عناصر جس چیز میں ہوں گے، اسے ایک محسوس شکل عطا کر دیں گے۔

قرآنی تعلیمات محسوس و مشہود شکل میں نبی اکرم ﷺ اور اُن کے رفقا کی زندگی میں یوں اُبھریں کہ ۱۴۰۰ سال گزرنے کے بعد نقش پا کی شوخی آج بھی یہ کہہ رہی ہے کہ ”کوئی ابھی ابھی یہاں سے گزرا ہے۔“ جب حقیقتیں محسوس طور پر سامنے آتی ہیں تو ان کے نتائج بھی ہم مرتب شکل میں دیکھ سکتے ہیں۔قرآن اس لیے بھی حق ہے کہ اس کی تعلیمات میں صحت و دوام ہے، اور اس لیے بھی کہ اس کی تعلیمات کے یہ پہلو انسانی زندگی میں نتائج کے طور پر مرتب ہو چکے ہیں۔حق کی لازمی پہچان یہ ہے کہ وہ باطل کے ساتھ سمجھوتا نہیں

کرسکتا۔بقول اقبال:

باطل دُوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

حق اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے اور حالات اس کے سانچے میں ڈھلتے رہتے ہیں۔ایک محترم بزرگ نے حق کے معانی کی قرآنی توضیح کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''جو زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دے سکے''۔

یہ توضیح گمراہ کن ثابت ہو سکتی ہے کیوں کہ حق زمانے کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتا، بلکہ زمانے کے تقاضے اس کا ساتھ دیتے ہیں۔کیوں کہ حق صاحب حِکمت بھی ہے اور صاحب تخلیق و ایجاد بھی۔اللہ اسی لیے حق ہے اور رسول و قرآن بھی اسی مفہوم کے اعتبار سے حق ہیں۔حق کا مقابل لفظ 'ظن' ہے جس طرح اسلام و کفر۔اور ظن و حق کا فرق یہی تو ہے:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

مومن میں آفاق اس لیے گم ہوتے ہیں کہ حق اسے صاحب فقر غیور بنا دیتا ہے۔حق کے سلسلے میں قرآن نے یہ بات بھی واضح

> قرآن جہاں روح، جنّت اور اللہ کے انعامات کا ذکر کرتا ہے وہاں الفاظ پر جبرئیلؑ کی آواز بن جاتے ہیں اور جہاں احکام و ہدایت دیتا ہے وہاں ہر لفظ زندگی کی طرح سنگین ہے۔اسالیب کا یہ تنوع اس کے اعجاز کا ایک پہلو ہے۔

کردی ہے کہ نَزَّلَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ یعنی حق (وحی الٰہی) ایک خارجی شے ہے، محض نبیؐ کے ذہن کی پیداوار نہیں۔خدا اسے نازل کرتا ہے، آدمی کا علم اسے منکشف نہیں کرتا۔حق کا استحکام و ثبات اسے محفوظ رکھتا ہے۔اسی لیے اللہ نے اپنی کتاب کو ذکریٰ اور تذکرہ کہا ہے:

ذٰلِکَ نَتۡلُوۡهُ عَلَيۡکَ مِنَ الۡاٰيٰتِ وَ الذِّكۡرِ الۡحَكِيۡمِ ۝ (آل عمران: ۵۸)

(اے محمد ﷺ) ہم تم کو یہ آیات اور حکمت بھری نصیحتیں (ذکر الحکیم) سناتے ہیں۔

ذکر

ذکر اس شے کو کہتے ہیں جو ذہن میں محفوظ ہو، جو بھلائی نہ جاسکے۔علامہ ابن مکرم صاحب تاج نے لکھا ہے کہ جو کتاب تفاصیل دینی اور قوانین اُمم پر حاوی ہو، وہ ذکر ہے۔قرآن میں دین کی تفاصیل بھی ہیں اور پرانی اُمتوں کے قوانین بھی محفوظ ہیں۔اسی کے ساتھ ساتھ ان کے تذکرے بھی۔تذکرہ کے معنی ہیں یاد کرنا اور یاد دلانا۔قرآن نے کہانی کے طور پر اپنے پڑھنے والوں کی دل چسپی کے لیے پرانی قوموں کے حالات نہیں پیش کیے ہیں، بلکہ اس لیے کہ ہم ان کے نتائج اور انجام کی روشنی میں اپنی روش حیات کا تعین کرسکیں۔

آج دنیا کے دوسرے مذاہب کی کتابیں (بالخصوص عہد نامۂ عتیق و جدید) جس صورت میں ہمیں ملتی ہیں وہ افسانے کی صورت میں ہیں، ایسے افسانے جن کی دل چسپیوں میں ہم گم ہو جائیں اور جب سطح پر اُبھریں تو رہنمائی کا کوئی تابناک اور درخشاں موتی ہمارے ہاتھ میں نہ ہو۔

فسانہ وفسوں میں گم شدہ ذہن صحف سماوی اور کتابِ قوانین سے بھی دل چسپی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جون ڈی یوہانن (John D.Yohannan) نے 'ایشیائی ادب' کے ایک مجموعے میں قرآنِ کریم کے انتخاب سے پہلے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ ''ادب کے ایک کارنامے کی حیثیت سے شدید دباؤ کے تحت ہے، کیوں کہ لازمی طور پر دنیا کے دوسرے سامی مذاہب کے صحف سے اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے''۔ (ٹریژری آف ایشین لٹریچر، مطبوعہ نیو امریکن لائبریری، اشاعت پنجم، ۱۹۶۴ء، ص ۳۸۹)

قرآنِ حکیم کے اسالیب وخصوصیات کے بارے میں آپ جو کچھ جانتے ہیں اور جو کچھ یہاں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس کے پیشِ نظر اس خیال پر تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ قرآن جہاں روح، جنّت اور اللہ کے انعامات کا ذکر کرتا ہے وہاں الفاظ پرِ جبرئیلؑ کی آواز بن جاتے ہیں، اور جہاں احکام وہدایت دیتا ہے وہاں ہر لفظ زندگی کی طرح سنگین ہے۔ اسالیب کا یہ تنوع اس کے اعجاز کا ایک پہلو ہے۔

ذکر کے معنیٰ عظمت اور بڑائی کے بھی ہیں۔ اس اعتبار سے بھی یہ کتاب جلیل 'الذکر' ہے۔ جس آیت کریمہ (آل عمران، آیت ۵۸) کا اقتباس ابھی آپ نے پڑھا ہے اس میں 'ذکر الحکیم' کے ساتھ ساتھ 'آیات' بھی کہا گیا ہے۔ آیت نشانی کو کہتے ہیں۔ اللہ کی نشانیاں ہماری ذات اور کائنات دونوں میں موجود ہیں

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات

قرآن حق ہے اور اس اعتبار سے اللہ کی سب سے محکم آیت اور نشانی ہے (ویسے قرآن کے ہر حکم یا جملہ کو آیت کہا جاتا ہے)۔ اللہ ہمارے دائرہ ادراک سے باہر ہے

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود

اور اس مسجود کے لیے قبلہ نمائی کے فرائض قرآنِ حکیم ادا کر رہا ہے۔ یہ معبود کی طرف سب سے اہم اشارہ ہے۔ اس میں غور وفکر لقائے رب کا وسیلہ بنتا ہے۔

موعظت

وہ کتاب جو بہت واضح ہو، جو قوانین کا مجموعہ ہو، جو ہدایت کی طرف رہنمائی کرتی ہو، جس کی بیان کردہ باتیں مستحکم حقائق کا درجہ رکھتی ہوں، اور جس میں ایمان والوں کے لیے 'بشارت' ہو۔ اس کا ایک پہلو 'وعظ' ضرور ہوگا۔ اور وہ کتاب موعظت کے درجے پر ضرور فائز ہوگی۔ ہدایت اور موعظت کا رشتہ حد درجہ منطقی ہے۔ جو چیز رہنمائی کرے گی، وہ راہ کے خطروں سے بھی ڈرائے گی، جیسے سڑک پر خطرے کی مختلف علامتیں اور عبارتیں ملتی ہیں۔ موعظت کے معانی ہیں: ''اعمال کے اچھے بُرے نتائج سے باخبر کرنا''، اس طرح کہ

دلوں کی کیفیت بدل جائے۔ بعض ائمہ لغت نے اس میں حکم کے پہلو کو بھی شامل کیا ہے۔ یعنی صرف خبر دینا نہیں، بلکہ حکم دینا اور (بُری باتوں سے) روک دینا۔ اسی اعتبار سے قرآن نے اپنے آپ کو موعظت کہا ہے:

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (اٰل عمران: ۱۳۸)

یہ (قرآن) انسانوں کے لیے بیان اور اہلِ تقویٰ کے لیے 'ہدایت' اور 'موعظت' ہے۔

قرآن حکیم کی جو صفات اللہ تعالیٰ نے اس مقدس اور آفاقی کتاب میں بیان فرمائی ہیں وہ ایک دوسرے سے جس قدر وابستہ ہیں ان کا ہلکا سا اندازہ اس حقیر کوشش سے ہوسکتا ہے۔ میری ناچیز رائے میں یہ صفات اس ترتیب کے ساتھ آتی ہیں کہ ہر صفت اپنے بعد آنے والی صفت کی وضاحت کر دیتی ہے۔

یعنی اس کتاب سے ایک طرف تو عام انسانوں کو دین حق کے بارے میں حقائق معلوم ہوتے ہیں اور دوسری طرف مومنوں اور متقیوں کے لیے یہ کتابِ ہدایت ہے ایسی ہدایت جو بُرے اعمال اور غلط روش کے نتائج سے آگاہ کرتی ہے اور حکماً ان سے روکتی بھی ہے۔

علم

ہدایت اور موعظت کے لیے لازمی ہے کہ وہ حق ہو اور حق کا تعلق علم سے ہے۔ قرآن اللہ کا علم ہے۔ اس اجمال کی تفصیل مناسب ہوگی۔ اللہ نے اسے اپنے علم سے نازل کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

لٰكِنِ اللهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ. وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ. وَكَفٰى بِاللهِ شَهِيْدًا (النساء: ۱۶۶)

اللہ نے جو کتاب تم پر نازل کی ہے اس کی نسبت وہ گواہی دیتا ہے کہ اس نے اپنے علم سے نازل کی ہے اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور اللہ کافی ہے گواہی کے لیے۔

یہ ہے قرآن کے بارے میں اس کے بھیجنے والے کا بیان، اور خطاب ہے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے۔

'علم' یقین اور حقیقت کے احاطہ و ادراک کو کہتے ہیں۔ یقین اور حقائق کی بنیاد دلیل و بُرہان پر ہوتی ہے۔ حق اور علم کو محض جذبات کا سہارا نہیں لینا پڑتا بلکہ حق اپنے آپ کو دلیل اور عقل کی بنیادوں پر منواتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عقلی طور پر حقائق کو قبول کرنے کے بعد ہم انھیں اپنے جذبات کے پیکر میں ڈھال لیں۔ عقل اور دل کے درمیان اتنے فاصلے نہیں ہیں جن کا عام طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ ایک طرف اگر مومن کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ:

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ (المائدۃ: ۸۳)

اس کتاب کو سن کر ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔

تو دوسری طرف اسی جماعت کے لیے کہا گیا ہے کہ وہ:

لَمۡ یَخِرُّوۡا عَلَیۡھَا صُمًّا وَّ عُمۡیَانًا (الفرقان: ۷۳)

''اس کتاب پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں رہ جاتے''

بلکہ اسے ذہنی اور عقلی طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ اس کتاب کی تفصیلات علم کے ستونوں پر بلند کی گئی ہیں۔

فَصَّلۡنٰہُ عَلٰی عِلۡمٍ (الأعراف: ۵۲)

بُرھان اور نُورِ مبین

قرآن 'بُرہان' ہے اور یہ بُرہان بھی ایسی واضح کہ اسے 'نُورِ مبین' کہا گیا:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَ کُمۡ بُرۡھَانٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ اَنۡزَلۡنَآ اِلَیۡکُمۡ نُوۡرًا مُّبِیۡنًا (النساء: ۱۷۴)

اے لوگو! تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس بُرہان آچکی اور تمھاری طرف واضح نُور بھیج دیا۔

'بُرہان' روشن اور مستحکم دلیل کو کہتے ہیں۔ باطل کے پاس بودی دلیلیں تو ہوتی ہیں لیکن بُرہان نہیں ہوتی۔ اسی لیے قرآن نے اپنے مخالفین سے کہا کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیلیں اور بُرہان لاؤ۔ ظاہر ہے کہ باطل کے ترکش میں بُرہان کا تیر کہاں سے آیا؟

قرآن نے اپنے کو بُرہان کے ساتھ ساتھ نُور بھی کہا ہے اور اس نور کے ساتھ ساتھ مبین کی صفت بھی آئی ہے۔ گویا قرآن کی دلیلیں خود بھی روشن ہیں اور دوسری چیزوں کو بھی روشن کر دیتی ہیں۔ اس طرح یہ بُرہان (اور کتاب) اپنا ثبوت آپ ہے۔

جو معروضات پیش کی گئی ہیں ان کی روشنی میں غور فرمایئے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ نُور کا ہدایت (ھُدیٰ) سے گہرا اور راست رشتہ ہے۔ جو چیز نُور نہ ہو وہ سببِ ہدایت نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ نُور اشیا، ارادوں، افراد سب کے مقام کا تعین کرتا ہے۔ جو شے حقیقی معنوں میں نُور ہو گی وہ وسعت اور فراخی سے ہم کنار ہو گی۔ اس کا دائرہ اور احاطہ وسیع ہو گا۔ قرآن نُور بھی ہے، اللہ کے احکام کے نُور کا سفر بھی ہے اور سفر کی داستان بھی۔ یہ نُور جو ہر دور میں وحی کے ذریعے انسانوں کو ملا۔ اس طرح قرآن نُور، حق، ہدایت اور ان تمام صفات جن کا ذکر آچکا ہے یا آئے گا، کے ساتھ ساتھ مُھَیمن ہے۔ مُصَدِّق اور مُھَیۡمِن میں نہایت لطیف فرق ہے۔ قرآن نے ان دونوں صفات کو ایک ساتھ استعمال کر کے اس فرق کو اور اُبھار دیا ہے:

وَ اَنۡزَلۡنَآ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ مُھَیۡمِنًا عَلَیۡہِ (المائدۃ: ۴۸)

پھر اے نبیؐ! ہم نے تمھاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے، اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اُس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے۔

قرآن اللہ کے ابدی قوانین (جو پہلی کتابوں میں آچکے ہیں) کی تصدیق بھی کرتا ہے اور ان کا پوری طرح احاطہ بھی کیے ہوئے ہے۔ اسی لیے ان صفات کی روشنی میں اسی آیت میں آگے چل کر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ''جو حکم اللہ نے نازل فرمایا ہے اس کے مطابق اُن کا فیصلہ کرنا اور جو حق تمھارے پاس آچکا ہے اسے چھوڑ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا''۔ (المائدہ: ۴۸)

قرآنِ حکیم صحفِ اولیٰ کا مُھَیۡمِن اس لیے ہے کہ اس کے سہارے انسان اپنی منزل تک پہنچ سکے اور منزل تک پہنچنے کے

لیے اسے جس سہارے کی ضرورت ہے وہ یہی ابدی تعلیمات ہیں۔اسی لیے قرآن نے اپنے آپ کو بلاغ بھی قرار دیا ہے:

وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ (الانعام: ۱۹)

اور یہ قرآن مجھ پر اس لیے وحی کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعے سے تم کو اور جس تک پہنچ سکے اسے آگاہ کر دوں۔

اِنذار (ڈراوے) کا ذکر بشارت کے ساتھ ہونا چاہیے تھا کیوں کہ بشارت اور اِنذار دونوں سے مل کر ایک بات کی تکمیل ہوتی ہے۔قرآن مومنوں کے لیے بشارت ہے تو غلط روشِ حیات کو اپنانے والوں کے لیے اِنذار اور تنذیر آگاہ کرنے کو کہتے ہیں۔کسی ایسی

> حکمت کا ترجمہ عام طور پر دانائی کیا گیا ہے، لیکن دانائی اتنا چھوٹا لباس ہے جو اِس عظیم اصطلاح کے جسم پر راست نہیں آسکتا۔حکمت میں قوتِ فیصلہ، انصاف، حسن اور تناسب کے سب مفہوم ہیں۔قرآن کو حکمت ِ بالغہ کہا گیا ہے، کیوں کہ یہ انسان کو اُن فیصلوں، اُس تناسب اور مقامِ عدل تک پہنچاتی ہے جو اس کی منزل ہے۔حکمت میں قوت کا عنصر بھی شامل ہے، اور یہی عنصر اسلامی نظامِ مملکت کو ایک نظامِ حکمت بنا دیتا ہے۔

چیز (خطرے) کے نتائج سے آگاہ کرنے کو جو ابھی واقع نہ ہوئی ہو۔قرآن نے زندگی کے دو اسالیب کو صاف صاف پیش کر دیا ہے: ایک اسلام، دوسرا کفر۔ایک کے لیے بشارت ہے، دوسرے کے لیے اِنذار۔لیکن اس ڈراوے اور آگاہی سے صرف وہی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جن کے دل مقفّل نہ ہوں۔کان کھلے ہوں اور آنکھیں دیکھ رہی ہوں ورنہ:

سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (البقرۃ: ٦)

ان کے حق میں برابر ہے خواہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں۔وہ ایمان نہ لائیں گے۔

قرآن حکیم کی جو صفات اللہ تعالیٰ نے اس مقدس اور آفاقی کتاب میں بیان فرمائی ہیں وہ ایک دوسرے سے جس قدر وابستہ ہیں ان کا ہلکا سا اندازہ اس حقیر کوشش سے ہوسکتا ہے۔میری ناچیز رائے میں یہ صفات اس ترتیب کے ساتھ آتی ہیں کہ ہر صفت اپنے بعد آنے والی صفت کی وضاحت کر دیتی ہے۔

مبارک

وہ کتاب جو انسانیت کے لیے ہدایت، بشارت اور حکمت ہے، وہ کتنی مبارک ہوگی:

وَ ھٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَ اتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (الانعام: ۱۵۵)

اور یہ مبارک کتاب (بھی) ہم نے نازل کی ہے۔پس اس کی پیروی کرو۔اور (اللہ کا) تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

'مبارک' کی وضاحت اسی آیت کریمہ میں تقویٰ اور رحم سے ہوگئی ہے۔'مبارک' وہ چیز ہے جس میں ایسا ثبات ہو، یا ایسا ثبات دوسروں کو عطا کرے جس میں استحکام کے ساتھ نمو بھی ہو، یعنی بڑھتے رہنے کی صلاحیت۔اُردو میں یہ لفظ اپنی وسعتوں کے ساتھ منتقل

ہوا ہے: ''اس کے ہاتھ میں کتنی برکت ہے''۔''اس کے قدم ہمارے گھر کے لیے کتنے مبارک ثابت ہوئے''۔ثبات اور نمو کے ساتھ ساتھ برکت میں خیر وفلاح اور کثرت کے معنی بھی موجود ہیں۔

مفصّل

قرآن فرقان ہے۔اس پر گفتگو ہو چکی ہے۔کتاب اللہ نے اپنے آپ کو فرقان کے ساتھ کتاب، بیان اور آیات بھی کہا ہے۔ان سب لفظوں میں وضاحت کے معنی ہیں۔ایسی وضاحت جو روشن ہو اور چیزوں کو الگ الگ کر دے۔پھر یہ 'علم' بھی ہے وہ علم جس میں تفصیل ہو۔ان حقائق کے پیش نظر خالق اکبر نے اپنی کتابِ حمید کو کتابِ مفصل کہا ہے:

قرآن نے اسی عبرت کی خاطر تاریخ کو بڑی اہمیت دی ہے اور اسے وقائع نگاری کی سطح سے بلند کر کے فلسفے کی اس سطح تک پہنچا دیا جس نے عہدِ حاضر کو تاریخ کے مفہومِ حقیقی سے آشنا کرایا۔

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (الانعام:۱۱۴)

اور وہی تو ہے جس نے تمھاری طرف مفصل کتاب بھیجی۔

قرآن دین وکفر اور حق و باطل کے درمیان حدِ فاصل ہے اور اس اعتبار سے یہ کتاب مفصل ہے۔پھر اس لحاظ سے بھی کہ نہایت وضاحت رکھنے والی کتاب ہے۔وضاحت کا مفہوم ذہن میں واضح ہونا چاہیے۔اس کے احکام میں اُلجھن نہیں۔یہی صفائی وضاحت ہے۔وضاحت تفصیلات کو نہیں کہتے۔قرآن کے احکام میں کہیں اُلجھن نہیں۔اس میں جہاں تفاصیل اور عملی مثالیں نہیں دی گئی ہیں، اس کا مقصد یہ ہے کہ انھیں اسوۂ حسنہ نبی ﷺ میں تلاش کیا جائے جو قرآن کے اجمال کی تفصیل اور اشارات کی تفسیر ہے۔

رحمت

انسانیت گمراہی وضلالت کی وادیوں میں بھٹک رہی تھی، کہیں بھی روشنی نظر نہیں آتی تھی۔ان حالات میں یہ مبارک، مفصل اور ہدایت کرنے والی کتاب رحمت بن کر نازل ہوئی:

فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ (الانعام:۱۵۷)

تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن اور ہدایت اور رحمت آگئی ہے۔

یہ کتاب انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی ایسی دین اور عطا ہے جس نے اس کی کمیوں کو دُور کر دیا ہے۔کمی دو قسم کی ہو سکتی ہے: داخلی اور خارجی۔داخلی کمی کا تعلق انسانوں کی دنیا میں تہذیب، ثقافت اور اندازِ فکر سے ہوتا ہے، اور خارجی کمی کا تعلق تمدن، معاشرتی زندگی اور رہن سہن سے۔قرآن نے ان دونوں کمیوں سے انسان کو نجات دلا دی۔ایک طرف توحید، رسالت، قیامت، عدل، مساوات، اخوت اور ایسی ہی دوسری بنیادی اقدار کی بنا پر ذہن کی دنیا میں انقلاب برپا کیا اور دوسری طرف سیرتِ اجتماعی کو اس ذہنی انقلاب نے یکسر بدل دیا۔

رحمت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔اس کے کئی معنوی پہلو (shades) ہیں۔رحمت کمیوں کو دُور کرنے والی عطا اور بخشش کو بھی کہتے ہیں اور حفاظت کرنے کو بھی۔قرآن نے نقصانات اور خسر و نامرادی کے طوفانوں کے مقابل میں انسان کو اپنے دامن رحمت میں چھپا لیا۔مجموعی طور پر وحی الٰہی کو رحمت کہا گیا ہے اور قرآن کو خاص طور پر، کیوں کہ قرآنِ حکیم پر سلسلۂ وحی ختم ہوا اور اس میں قیامت تک کے لیے انسانوں کے واسطے سامانِ رحمت ہے۔رحمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ عطا اور بخشش جو ضروریات کے مطابق ہو۔

بصائر

اللہ تعالیٰ نے قرآن کو بصائر کہا ہے:

هٰذَا بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّکُمۡ وَ هُدًی وَّ رَحۡمَةٌ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ (الأعراف:۲۰۳)

یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں تمھارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو اسے قبول کریں۔

بصائر جمع ہے اور کتاب کو بصائر کہنا بلاغت کی اعلیٰ ترین مثال بھی ہے اور اس کتاب کے مقام اور اس کے ایک پہلو کا نہایت ہی جامع احاطہ بھی۔وہ یوں کہ قرآن واضح دلیلوں اور واشگاف حقیقتوں کا مجموعہ ہے، ایسی حقیقتیں جن میں چمک اور روشنی ہو۔یہی وضاحت اور روشنی بصیرت کو دیکھنے سے اور بصر کو نظر سے ممتاز اور علاحدہ کر دیتی ہے۔قرآن نے اس حقیقت کا اظہار یوں فرمایا ہے:

وَ تَرٰهُمۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَیۡکَ وَ هُمۡ لَا یُبۡصِرُوۡنَ (الأعراف:۱۹۸)

ان کو آپ دیکھتے ہیں کہ گویا وہ آپ کو دیکھ رہے ہیں، حالاں کہ وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے۔

حکمت

تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡحَکِیۡمِ (یونس:۱)

یہ کتابِ حکیم کی آیتیں ہیں۔

وَ الۡقُرۡاٰنِ الۡحَکِیۡمِ (یٰسٓ:۲)

قسم قرآنِ باحکمت کی۔

حِکۡمَةٌۢ بَالِغَةٌ (القمر:۵)

یہ کتاب حکمت ِبالغہ سے عبارت ہے۔

حکمت کا ترجمہ عام طور پر دانائی کیا گیا ہے لیکن دانائی اتنا چھوٹا لباس ہے جو اِس عظیم اصطلاح کے جسم پر راست نہیں آسکتا۔حکمت میں قوت ِفیصلہ، انصاف، حسن اور تناسب کے سب مفہوم ہیں۔قرآن کو حکمت ِبالغہ کہا گیا ہے، کیوں کہ یہ انسان کو اُن فیصلوں، اُس تناسب اور مقامِ عدل تک پہنچاتی ہے جو اس کی منزل ہے۔حکمت میں قوت کا عنصر بھی شامل ہے، اور یہی عنصر اسلامی نظامِ مملکت کو ایک نظامِ حکمت بنا دیتا ہے۔

شفاء

شفا صحت اور بیماری کے بعد حصولِ صحت کو کہتے ہیں۔ انھی بنیادی معنوں کی وجہ سے اس میں استعارہ کا پہلو پیدا ہو گیا اور علاج اور دوا کو بھی شفا کہا جانے لگا۔ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے شفا کہا ہے کیوں کہ یہ انسان کی روحانی، ذہنی، سماجی اور عمرانی بیماریوں کا علاج ہے:

يَآيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ. (یونس:۵۷)

لوگو! تمھارے رب کی طرف سے موعظت اور دلوں کی بیماریوں کی شفا اور مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت آ گئی۔

ما فی الصدور کا اشارہ قلب کی طرف ہے۔ قلب جس کی صحت سارے جسم بلکہ انسانی معاشرے کی صحت ہے۔ اور اگر گوشت کا یہی ٹکڑا بیمار ہو تو سارا جسم (اور روح) بیمار ہوتا ہے، یعنی پوری زندگی بیماری میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

قرآن خیر ہے، کیوں کہ اس میں عزت، نفع بخشی، خوبیاں، مرتبۂ بلند، تناسب، حسن، یہ سب چیزیں ہیں، اور اس کی پیروی سے یہی چیزیں مومنوں کو انفرادی طور پر اور پھر اجتماعی طور پر نصیب ہوتی ہیں۔ اپنی اجتماعی زندگی کو قرآن کے مطابق ڈھالنے کا مطالبہ اس لیے کیا جا رہا ہے کہ یہ برکتیں ہمارے معاشرے کی بنیادیں بن سکیں۔

عبرت

سورۂ یوسف میں قرآن (اور اس کے قصص) کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ (یوسف: ۱۱۱)

ان میں سوچنے سمجھنے والوں کے لیے عبرت ہے۔

یعنی یہ واقعات ایسے ہیں جن کی مدد سے انسان ان جیسے دوسرے واقعات و اعمال کے نتائج تک پہنچ جائے۔ ایک منزل سے دوسری منزل کو عبور کرنا۔ عبور کا لفظ اُردو میں ان معنوں میں مستعمل ہے۔ تاریخ عبرت کا سامان اسی لیے ہے کہ اس سے ہم مختلف طریقہ ہائے حیات اور اسالیبِ زیست کے نتائج کو سمجھ لیتے ہیں اور اس کی تفہیم کے لیے ان نتائج کو آنکھوں سے دیکھنا ضروری نہیں۔

قرآن نے اسی عبرت کی خاطر تاریخ کو بڑی اہمیت دی ہے اور اسے وقائع نگاری کی سطح سے بلند کر کے فلسفے کی اس سطح تک پہنچا دیا جس نے عہدِ حاضر کو تاریخ کے مفہوم حقیقی سے آشنا کرایا۔

عظیم

سورۂ حجر (آیت:۸۷) میں قرآن کو 'القرآن العظیم' کہا گیا ہے۔ عظیم بنیادی اہمیت کی حامل چیزوں کو کہتے ہیں، مثلاً انسانی جسم میں ہڈی کو، کسان کے ہل میں لکڑی کو وغیرہ وغیرہ۔ عظمت میں اہمیت، بڑائی اور پاکیزگی کے مفاہیم موجود ہیں۔ قرآن اس لیے

عظیم ہے کہ اس کی بنیادی تعلیمات اہم ہیں اور انسان کو بڑائی اور پاکیزگی عطا کرتی ہیں۔ اللہ نے اپنے آپ کو بھی انھی معانی کے پیشِ نظر عظیم کہا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب مسلمانوں نے کتاب اللہ کو مضبوط رسی کی طرح ہاتھ میں پکڑا تو دنیا کی ہر طاقت اور سارے معبودانِ باطل اس کے سامنے جھک گئے۔ آج ہم عملی و نظری طور پر اس کتابِ عزیز سے اتنے دُور ہیں کہ اس میں ایسے اندازِ حیات کا سراغ تلاش کرتے ہیں جو ہمیں ترکِ جہان کی لذت عطا کر سکے۔

خیر

سورۂ نحل میں ارشاد ہوا ہے:

وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْا خَيْرًا (النحل: ۳۰)

اور جب متقیوں سے پوچھا جاتا ہے کہ تمھارے رب نے کیا نازل کیا ہے تو کہتے ہیں کہ خیر۔

عربی کی طرح اُردو میں بھی خیر کا لفظ 'شر' کے مقابل میں استعمال ہوتا ہے۔ ہر چیز جو عزیز ہو، منفعت بخش ہو، اچھی ہو، خوبی رکھتی ہو اور بلند مرتبہ ہو، وہ خیر ہے۔ قرآن میں یہ لفظ کئی معنوں میں آیا ہے، مثلاً: (۱) شر، فتنہ اور ادنیٰ کے مقابلے میں (۲) مال و دولت کے لیے (۳) منتخب اور برگزیدہ افراد کے لیے (اخیار) (۴) عمدہ اشیا کے لیے (۵) حسین اور صاحبِ کردار خواتین کے لیے (خیرات)۔

قرآن نے وحی الٰہی کو بھی اسی لیے خیر کہا ہے کہ اس لفظ کی ان وسعتوں کے پیشِ نظر اس کا مروجہ اُردو ترجمہ 'بہترین' یا 'بہترین کلام' بہت تنگ معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ 'خیر' کا لفظ جب ہماری زبان نے قبول کر لیا ہے تو اس کے ترجمے کی کون سی ضرورت ہے؟ قرآن خیر ہے، کیوں کہ اس میں عزت، نفع بخشی، خوبیاں، مرتبۂ بلند، تناسب، حسن، یہ سب چیزیں ہیں، اور اس کی پیروی سے یہی چیزیں مومنوں کو انفرادی طور پر اور پھر اجتماعی طور پر نصیب ہوتی ہیں۔ اپنی اجتماعی زندگی کو قرآن کے مطابق ڈھالنے کا مطالبہ اس لیے کیا جا رہا ہے کہ یہ برکتیں ہمارے معاشرے کی بنیادیں بن سکیں۔

احسن

خیر کے معنوں کا ایک اہم پہلو حُسن ہے۔ قرآن صرف حسین نہیں بلکہ احسن ہے:

وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (الزمر: ۵۵)

تم کو چاہیے کہ اپنے رب کے پاس سے آئے ہوئے، اچھے اچھے حکموں پر چلو۔

یعنی خدا نے جو کچھ نازل کیا ہے اس میں حد درجہ تناسب و توازن ہے۔ ایسا تناسب جو انسانی زندگی اور ذہن کی کمیوں کو پورا کر

دیتا ہے۔ جہاں حُسن ہوگا وہاں سیئات اور گناہوں کی گنجایش نہ ہوگی۔

عزیز

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ (حم السجدۃ: ۴۱)

وہ ایک کتابِ عزیز (عالی مرتبت کتاب) ہے۔

اگلی ہی آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ اس پر جھوٹ کا دخل نہ آگے سے ہوسکتا ہے نہ پیچھے سے، کیوں کہ یہ حکیمِ حمید (اللہ) کی نازل کردہ ہے (حم السجدہ: ۴۱)۔ عزیز صاحب قِوت، صاحب غِلبہ اور محافظ و رفیع کو کہتے ہیں۔ یہ صفت قرآن میں اللہ تعالیٰ کے لیے بار بار آتی ہے کیوں کہ اس کے پیغام پر عمل کر کے مسلمان قوت و غلبہ حاصل کرسکتا ہے اور ایسی بلندی پر پہنچ سکتا ہے کہ ستارے اس کی گردِ راہ ہوں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب مسلمانوں نے کتاب اللہ کو مضبوط رسی کی طرح ہاتھ میں پکڑا تو دنیا کی ہر طاقت اور سارے معبودانِ باطل اس کے سامنے جھک گئے۔ آج ہم عملی و نظری طور پر اس کتابِ عزیز سے اتنے دُور ہیں کہ اس میں ایسے اندازِ حیات کا سراغ تلاش کرتے ہیں جو ہمیں ترکِ جہان کی لذت عطا کرسکے:

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر

میزان

'خیر' اور 'حسن' میں توازن اور تناسب پر گفتگو ہو چکی ہے۔ یہی احساسِ عدل و تناسب ہمیں 'میزان' کے لفظ میں بھی ملتا ہے۔ عدل ان ابدی اور بنیادی اقدار میں سے ہے جو قرآن نے حیاتِ انسانی کو عطا کی ہیں۔ عدل کے لیے پیمانے کی ضرورت ہے۔ میزان یہی پیمانہ ہے۔ وَضَعَ الْمِيْزَانَ (الرحمٰن: ۷) یعنی اللہ نے تمام اشیا میں ایک 'عدل' توازن اور تناسب رکھ دیا ہے۔

قرآن کو اس لیے اللہ نے میزان کہا ہے کہ اس سے ہم اشیا اور بالخصوص انسانی زندگی کے توازن و اعتدال کو ناپ سکتے ہیں:

اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ (الشوریٰ: ۱۷)

اللہ ہی ہے جس نے اِس کتاب (قرآن) کو انصاف اور حق کے ساتھ نازل فرمایا۔

امام

قرآن کو اللہ تعالیٰ نے امام بھی کہا ہے: اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب لوگوں کے لیے امام اور رحمت تھی۔ (الاحقاف: ۱۲) یعنی قرآن بھی امام ہے۔ امام کا لفظ ھُدیٰ کے تصور کو اور آگے لے جاتا ہے۔ امام آگے آگے رہنے یا چلنے والے کو کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں قرآنی تعلیمات کو امام بنا کر زندگی کا راستہ طے کرنا چاہیے۔

عربی

قرآن نے اپنے آپ کو قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا کئی جگہ کہا ہے۔ عام تصور یہ ہے کہ چوں کہ یہ کتاب عربی میں نازل ہوئی ہے اس لیے اسے

یہ نام دیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن عربی میں نازل ہوا۔لیکن اگر غور کیا جائے تو خود قرآن میں ایک اور پہلو سے اس کی یہ وضاحت بھی ملتی ہے:

وَ كَذٰلِكَ اَنۡزَلۡنٰهُ حُكۡمًا عَرَبِيًّا (الرعد:۳۷)

اور اسی طرح ہم نے اس کو اس طور پر نازل کیا کہ وہ ایک خاص حکم ہے عربی زبان میں۔

یہاں 'حکمِ عربیٔ' سے مراد واضح حکم کے ہیں۔ایسا حکم جو فصیح زبان میں ہو۔عربی کے معنی صرف جغرافیائی حد تک محدود نہیں، بلکہ فصیح اور واضح کرنے کو بھی کہتے ہیں۔اسی لیے کہا گیا کہ:

قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا غَيۡرَ ذِىۡ عِوَجٍ (الزمر:۲۸)

یعنی جس کی کیفیت یہ ہے کہ عربی قرآن ہے جس میں ذرا کجی نہیں۔ یہاں غَيۡرَ ذِىۡ عِوَجٍ، عَرَبِيًّا کی تشریح ہے، یعنی قرآن جو بہت واضح اور سیدھا ہے اور جس میں کوئی کجی نہیں۔یعنی یہ کتاب عربی زبان میں نازل ہوئی اور اس کی تعلیمات بہت واضح اور سیدھی ہیں۔ ہر کجی سے پاک، ہر دور کے لیے رہنما اور روشن۔

قرآن میں ناسخ ومنسوخ کی تحقیق

تحریر: مولانا سید محمد یوسف بنوری
ترجمانی: مولانا عبدالرشید بستوی

قرآن کریم میں ناسخ ومنسوخ کی تعداد کی بابت علمائے متقدمین ومتأخرین میں اختلاف ہے۔ حضرات متقدمین کے نزدیک ناسخ ومنسوخ کی تعداد زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی رائے میں عام کی تخصیص، خاص کی تعمیم، مطلق کی تقیید، مقید کا اطلاق، استثنا وترک استثنا، حکم کا بالکلیہ منسوخ ہو جانا اور علت وسبب کے ختم ہو جانے کے باعث، حکم کا موقوف ہو جانا، یہ سب نسخ کہلاتا ہے۔ ان کے برخلاف متأخرین نے نسخ کی تعداد کو کم کرنے کی کوشش کی۔ چناں چہ امام جلال الدین سیوطی نے بیس مقامات میں نسخ تسلیم کیا ہے، جب کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی صرف پانچ جگہوں پر نسخ کے قائل ہیں۔ حضرت الاستاذ فرماتے تھے کہ قرآن متلو میں کوئی ایک بھی آیت حکماً منسوخ نہیں ہے، بہ ایں طور کہ کسی بھی صورت اور محمل میں اس کا حکم باقی نہ ہو، بلکہ کسی مرتبے، کسی حالت اور کسی نہ کسی وقت میں وہ حکم مشروع ضرور رہتا ہے۔ حضرت الاستاذ نے جو بات فرمائی، نہایت اہم ہے۔

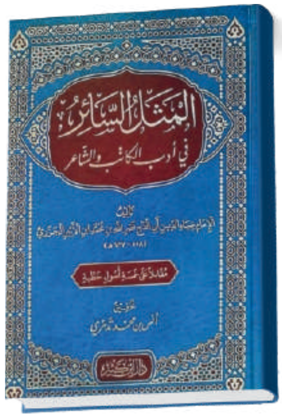

فرماتے! قرآن کریم میں ایک بھی حرف زیادہ نہیں، جس کا معنی ومفہوم کی تصویر کشی میں کوئی دخل نہ ہو، چناں چہ علامہ ابن اثیر جزری ''المثل السائر، ص: ۱۴۵'' پر لکھتے ہیں کہ ارشاد باری تعالیٰ ''فبما رحمة من الله لنت لهم'' میں حرف ''ما'' زائد نہیں ہے، بلکہ یہ اس نعمت الٰہی کی جلالت شان اور اہمیت کو بتانے کے لیے آیا ہے، جس کے سبب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قلب نرم ہوگیا تھا۔ یہ عین تقاضائے فصاحت ہے۔ اگر یہاں حرف 'ما' نہ ہوتا تو جلالت وعظمت شان معلوم نہ ہوتی۔ قدیم اہل عرب کے یہاں بھی اس طرح کی ترکیبیں پائی جاتی ہیں، مثلاً ''زبّاء'' کہتا ہے: ''أما انه ليس ذلک من عوز المواس ولا من قلة الأواس ولكنه شيمة ما أناس'' ترتیب جملہ یوں ہے ''ولكنه شيمة أناس'' أناس سے پہلے حرف ''ما'' اس عادت کے حامل کی جلالت قدر اور عظمت شان کو بتانے کے لیے لایا گیا ہے۔ اگر اس جملے سے ''ما'' کو ساقط کر دیا جائے تو یہ عظمت وجلالت باقی نہ رہے گی۔ اس نزاکت کو علمائے فصاحت وبلاغت ہی اچھی طرح سے جانتے ہیں۔

''جہاں تک علمائے نحو کی اس بات کا تعلق ہے کہ ''ما'' زائدہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ''ما'' اپنے ماقبل کے عامل کو عمل کرنے سے روکتا نہیں ہے۔ علمائے نحو بعض مقامات پر ''ما'' کو ''کافہ'' کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ''ما'' اپنے ماقبل کے عامل کو

مابعد میں عمل کرنے سے روک دیتا ہے۔آیت بالا میں بھی ’ما‘‘زائد ہے کہ اس کی وجہ سے ’با‘‘حرف جار کے لفظ ’رحمة‘‘ پر عمل کرنے میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

شیخ رافعی اپنی کتاب ’اعجاز القرآن‘‘، طبع سوم، ص: ۳۰۴ ، پر رقم طراز ہیں:

’’پھر جن حروف والفاظ کی بابت خیال ہے کہ وہ قرآن میں زائد ہیں، جیسے علمائے نحو ارشاد باری تعالی فبما رحمة من الله لنت لهم اور فلما أن جاءه البشير کی بابت کہتے ہیں کہ پہلی آیت میں حرف ’ما‘ اور دوسری میں حرف ’أن‘‘زائد ہے، یعنی از روئے اعراب بھی اور از روئے معنی بھی تو جس شخص کو بصیرت نہیں وہ سمجھتا ہے کہ جیسے یہ حروف اعراب کے لحاظ سے زائد ہیں، ویسے ہی نظم میں بھی زائد ہیں۔ حالاں کہ ان حروف کا معنی ومفہوم کی تشریح وتوضیح میں ایک کردار ہے اگر انہیں حذف کر دیا جائے تو نظم قرآنی کا حسن وجمال اور عظمت و جلالت شان جاتی رہے۔ پہلی آیت کا مقصد حضور اکرم ﷺ کی اپنی قوم کے حق میں نرم دلی اور اس بات کی تصویر کشی کی ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کا فضل وکرم اور اس کی رحمت خاص ہے۔حرف ’’ما‘‘ کے ذریعہ اس نرم دلی کی عظمت وجلالت شان موکد ہوگئی ہے۔ مزید برآں اس کا انداز کا تلفظ شفقت وعنایت کا پتہ دیتا ہے اور یہ مفہوم اس سے بہتر صورت میں کسی دوسری ترکیب سے پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ نیز حرف جار ’با‘‘ اور اس کے معمول مجرور ’’رحمة‘‘ میں حرف کے ذریعہ فصل کرنے کے سبب، طبیعت اس کے معنی ومفہوم پر غور کرنے اور اس میں پائی جانے والی رحمت الٰہی کی اہمیت اور قدر وقیمت کا اندازہ لگانے کے لیے لازمی طور پر متوجہ ہوتی ہے اور یہ سب کچھ اس آیت کی بلاغت وفصاحت کے تعلق سے ایک قدرتی سی بات ہے۔ جب کہ دوسری آیت کا مقصد اس فاصلہ اور بعد مسافت کی تصویر کشی ہے جو خوش خبری دینے والے قاصد کے حضرت یوسف علیہ السلام کا کرتا لے کر چلنے اور اس کی کنعان آمد کے درمیان پایا جاتا تھا کہ حضرت یوسف تو مصر میں تھے اور ان کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کنعان میں۔ نیز یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام بڑی بے چینی اور اضطراب کے عالم میں اس قاصد کی آمد کے منتظر تھے۔ یہ بے چینی اور قاصد کی آمد پر بے پناہ مسرت، کلمہ فاصلہ ’أن‘‘ کے غنہ سے مزید موکد ہو جاتی ہے۔ الغرض! قرآن کریم کے جن الفاظ وحروف کی بابت یہ خیال ہے کہ زائد ہیں وہ سب اسی قسم کے معنی ومفہوم کی توضیح وتاکید کے لیے آئے ہیں۔ بالکل ہی زائد اور خالی از معنی نہیں؛ کہ یہ بات قرآن کریم میں نقص کے مترادف ہے۔‘‘

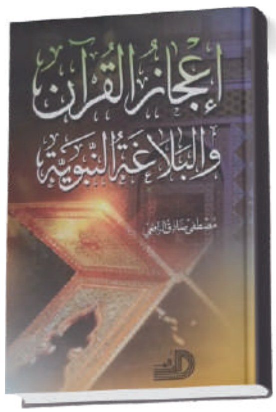

حضرت الاستاذ فرماتے کہ علمائے اصول کے یہاں جو یہ قاعدہ مشہور ہے کہ ’اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے، نہ کہ خاص سبب وپس منظر کا‘‘ تو یہ قاعدہ عام اور کلی نہیں ہے۔ بلکہ اس حوالے سے سب سے اہم چیز متکلم کا مقصد ومنشا معلوم کرنا ہے، اس لیے کہ یہ ضروری نہیں کہ متکلم کا کلام ہر حال میں اس کے مقصد ومنشا کے مساوی وہم وزن رہے۔ چناں چہ بعض اوقات کلام متکلم کے مقصد سے عام ہوتا

ہے، بعض اوقات اس سے خاص اور کبھی بالکل مساوی و یکساں عموم الفاظ کا اعتبار اس وقت کیا جاتا ہے جب متکلم کا مقصد متعین نہ ہو اور نہ ہی کسی دلیل سے اس کا منشا معلوم ہو سکے۔ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے ”فاقرؤا ما تیسر منه“ پس پڑھو قرآن میں سے جو آسان ہو۔ کیا عموم الفاظ کو دیکھتے ہوئے اس سے یہ مراد لیا جانا درست ہے کہ پورے قرآن میں سے کوئی بھی ایک آیت نماز میں پڑھ لی جائے تو کافی ہے، نماز ہو جائے گی خواہ سورہ فاتحہ نہ پڑھی جائے؟ اگر کوئی شخص نماز کے دیگر فرائض و ارکان کی رعایت کیے بغیر، صرف ایک آیت پڑھ لے تو کیا اسے حکم قرآنی بجالانے والا کہا جائے گا؟ اور کیا سورۂ فاتحہ پڑھے اور دیگر فرائض و واجبات کی بجا آوری کے بغیر نماز ادا کرنے کو اس حکم قرآنی پر عمل کرنا قرار دیا جائے گا؟ ظاہر ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ جس کسی کا بھی یہ خیال ہے درست نہیں اور وہ جادۂ مستقیم سے ہٹا ہوا ہے۔ اس حکم سے تو قرآن کا مقصد بیماروں، مسافروں اور مجاہدین کے لیے قرأت میں تخفیف بیان کرنا ہے، کیوں کہ ان کے لیے نماز تہجد پڑھنی دشوار ہے۔ جہاں تک سورۂ فاتحہ کی رکنیت اور وجوب کا مسئلہ ہے تو یہ اس حکم الٰہی سے بالکل الگ ہے اور اس حکم قطعی پر زیادتی ہے، دلیل ظنی مثلاً خبر آحاد کے ذریعہ۔ چناں چہ احناف کے نزدیک مرتبۂ ظن میں یہ جائز ہے کہ حکم قطعی پر کسی ظنی حکم کی زیادتی کی جائے، جو درجہ میں اس حکم قطعی سے کم تر ہو، اگرچہ اس پر عمل کرنا ضروری اور واجب ہو۔ جب کہ شوافع کے نزدیک سورۂ فاتحہ کا پڑھنا درجۂ قطعیت میں فرض ہے۔ احناف ظنی حکم کو یکسر نظر انداز نہیں کرتے جیسا کہ سمجھا جاتا ہے، بلکہ احناف قطعی اور ظنی کے دو مرتبے قائم کرتے ہیں۔ اس طرح ہر حکم کو اس کا جائز مقام مل جاتا ہے کہ جو حکم دلیل قطعی سے ثابت ہے فرض اور جو دلیل ظنی سے ثابت ہے واجب۔ احناف کے یہاں جو یہ عام تعبیر ہے کہ ”کتاب اللہ پر خبر واحد سے زیادتی کرنا جائز نہیں“ تو یہ تعبیر مناسب نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احناف یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص سورۂ فاتحہ نہ پڑھے بلکہ کوئی دوسری سورت نماز میں پڑھے تو نماز دوبارہ پڑھنی ہوگی۔ قطعیات میں اجمال وابہام کسی خاص مقصد کے لیے ہوتا ہے، مثلاً امت کے لیے تسہیل و تیسیر کی خاطر۔ یہ ہے حضرت الاستاذ کے افادات کا حاصل جو احقر نے سمجھا ہے۔

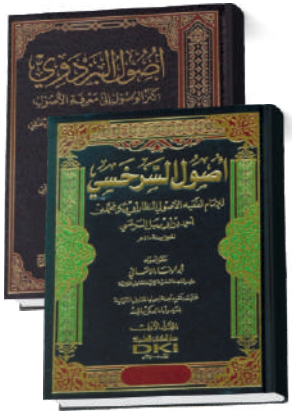

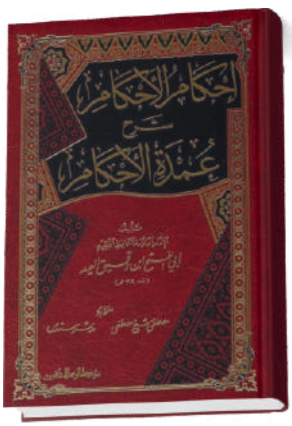

احقر نے حافظ حدیث امام ابن دقیق العید رحمہ اللہ کی کتاب ”إحكام الأحكام“ میں ایک نہایت اہم اور مفید بات دیکھی، جو حضرت الاستاذ کے کلام سے قریب تر ہے۔ حافظ ابن دقیق العیدؒ فرماتے ہیں:

”مشہور ہے کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے نہ کہ خاص سبب کا۔ مگر اس مناسبت سے دلالت سیاق، عام کو خاص کرنے کے قرائن اور متکلم کے مقصد و منشا نیز محض عام کے سبب کے مطابق وارد ہونے کے درمیان پائے جانے والے فرق کو سمجھنا ضروری ہے۔ ان دونوں کو ایک ہی جگہ نہیں رکھا جا سکتا۔ اس لیے کہ سبب کے مطابق عام کا وارد ہونا اس کی تخصیص کا مقتضی نہیں ہوتا۔ جیسے ارشاد باری

تعالیٰ''و السارق و السارقة فاقطعوا أيديهما'' چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت کے ہاتھ کاٹ دو- اس آیت کا شان نزول حضرت صفوان کی چادر چوری کیے جانے سے متعلق ہے، مگر بہ اتفاق حکم سرقہ اسی شانِ نزول کے لیے خاص نہیں ہے۔ چناں چہ سیاق کلام اور قرائن بتاتے ہیں کہ اس سے متکلم کا مقصد کیا ہے؟ اس سے مجمل کی تشریح اور محمل کی تعیین ہوتی ہے۔''(ص:۲۲۵، ج ۲)

ارتقائی استشراقی نظریات کا مطالعہ مغرب کی تصدیق وحی و نبوت محمد ﷺ

صائمہ شہباز منج/ محمد شہباز منج

وحی و نبوت محمدی ﷺ کے حوالے سے مغربی افکار و نظریات کی تاریخ بتاتی ہے کہ اہل مغرب نے اس ضمن میں مختلف ادوار میں مختلف مواقف اور نقطہ ہائے نظر اپنائے ہیں۔ ہم نے اس تاریخ کا جائزہ لیا تو اسلام اور اہل اسلام کے لیے ایک مثبت اور خوش آئندہ نتیجہ سامنے آیا۔ ذیل کی سطور میں اس جائزے اور نتیجے کو پیش کرنا مطلوب ہے۔ اہل مغرب کے مختلف زمانوں کے نظریات کا یہ ناقدانہ جائزہ ان کے اپنے ہی افکار پر مبنی ہے۔ ان کے افکار و نظریات کو انھی کے اصول مطالعہ و تجزیہ کی روشنی میں پرکھا گیا ہے۔ حاصل بحث ان کے ناقدانہ رویوں سے واضح طور پر مترشح ہوتا ہوا نتیجہ ہے۔

قرون وسطی کے افسانے اور ان کا رد

وحی محمدی ﷺ سے متعلق روایتی مغربی تصورات کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ پہلے زمانے میں اہل مغرب

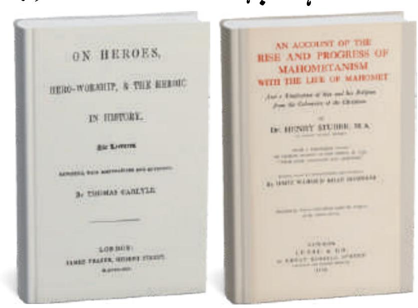

حضور ﷺ پر وحی کی توجیہ کے لیے کسی اسلامی ماخذ کی طرف رجوع کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔ وہ کسی ایسے شخص کا تخیل قائم کرتے جس نے اپنے ذاتی مفادات کی غرض سے وحی کا ڈھونگ رچایا ہو، اور اس تخیل کا مصداق آپ ﷺ کو ٹھہراتے۔ آپ ﷺ پر وحی کی توجیہ کے لیے عجیب وغریب اور شرمناک افسانے گھڑے گئے۔(1)

ایک عرصے تک اس نوع کے افسانے کہے جاتے رہے۔ پھر وہ دور آیا کہ مغربی اہل قلم نے اس نوع کے افسانوں پر سخت گرفت کرنا شروع کی؛ انھیں بے بنیاد اور لایعنی قرار دیا اور اہل مغرب کو ایسے فضول تخیلات سے نکلنے کی تلقین کی۔ مثلاً تھامس کارلائل (۱۷۹۵-۱۸۸۱) نے حضور ﷺ سے متعلق اس نوع کے تخیلات کو بے بنیاد، جھوٹ پر مبنی اور نئے زمانے میں ناقابل دفاع قرار دیتے ہوئے کہا کہ جب پوکاک (Pococke) نے گروشس (Grotius) (کبوتر پالنے کی کہانی کہنے والے) سے پوچھا کہ تمھارے پاس اس کہانی کا کیا ثبوت ہے، تو اس نے انتہائی ڈھٹائی سے جواب دیا: "کوئی ثبوت نہیں۔" یعنی یہ کتنی شرمناک بات ہے کہ ایک ایسی کہانی کا رواج ہو جائے جس کی سرے سے کوئی بنیاد ہی نہیں؟ اب زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ ایسی کہانیوں اور مفروضوں سے نجات حاصل کرنی چاہیے۔ کارلائل کے الفاظ ہیں:

> جس نوع کا کذب افترا اس شخص (محمد ﷺ) پر باندھا گیا وہ خود ہمارے لیے شرمناک ہے۔ جب پوکاک نے گروشس سے پوچھا کہ کبوتر کی کہانی کا کیا ثبوت ہے، جس کے مطابق سدھایا ہوا کبوتر آپ ﷺ کے کان سے دانے چگتا تھا اور آپ

ﷺ کو خیال ہوتا تھا کہ فرشتہ آپ ﷺ سے باتیں کر رہا ہے؟ تو گروشس نے جواب دیا: کوئی ثبوت نہیں! حقیقت یہ ہے کہ اس نوع کے افسانوں کے خاتمے کا وقت آگیا ہے۔ (2)

آپ ﷺ کی وحی سے متعلق مغرب کی افسانوی کہانیاں، اب اہل مغرب کے ہاں بھی اس درجہ لغو ثابت ہو چکی ہیں کہ زمانہ حال کا کوئی قابل ذکر مستشرق اس ضمن میں کوئی دلیل دینا گوارا نہیں کرتا۔ عہد جدید کے ہر سنجیدہ مستشرق کے ہاں ان کہانیوں کا تذکرہ اہل مغرب کے عہد جہالت اور پیغمبر اسلام سے بے جا تعصب و نفرت کی یادگار کے طور پر ہی ملتا ہے۔ وہ ایسی کہانیوں کو سختی

معروف مستشرق ولیم میور (۱۸۱۹-۱۹۰۵) آپ ﷺ کی اخلاقی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے:

اپنے تمام امور و معاملات میں آپ ﷺ انصاف پسند اور راست رو تھے۔ آپ ﷺ کے خوب صورت اور قابل قدر رویے نے تو جوانی ہی میں آپ ﷺ کو ''سچے اور دیانت دار'' کا لقب دلا دیا تھا۔

سے رد کرتے اور واضح کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کو دھوکے باز یا جھوٹا قرار دینا حقیقت کے ساتھ مذاق اور انتہائی ظلم ہے۔ پرنسٹن یونیورسٹی کے معروف لبنانی نژاد استاد ڈاکٹر فلپ کے۔ ہٹی (۱۸۶۰-۱۹۷۸) نے اہل مغرب کے ان افسانوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ قرون وسطی کے عیسائی محمد ﷺ کو سمجھنے میں سخت غلطی کے مرتکب ہوئے۔ آپ ﷺ کو نہایت حقیر کردار کا حامل ظاہر کیا گیا، نویں صدی عیسوی کے ایک یونانی قصہ گو نے آپ ﷺ کی تصویر کشی غلط انداز میں پیش کی۔ دانتے (۳) نے حضور ﷺ کے جسم اطہر کے بارے میں توہین آمیز بیان لکھا۔ نبی کریم ﷺ کے اسم مبارک کو بگاڑ کر دیگر معانی میں استعمال کرنے کی جسارت کئی مغربی اہل قلم کے ہاں ملتی ہے۔ منٹگمری واٹ جیسے مستشرقین نے اس طرز عمل پر تنقید کی ہے۔

واٹ نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ دنیا کی کسی عظیم شخصیت کی اس قدر مسخ شدہ تصویر پیش نہیں کی گئی جیسی مغرب نے محمد ﷺ کی پیش کی۔ مغرب کی اس حماقت کا ذکر کرتے ہوئے واٹ نے اسے محمد ﷺ کے خلاف مغرب کا سخت تعصب باور کرایا اور اس کے اسباب و وجوہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے مغرب کی دشمن اعظم تخلیق کرنے کی ضرورت کا شاخسانہ قرار دیا ہے، اس کے الفاظ ہیں:

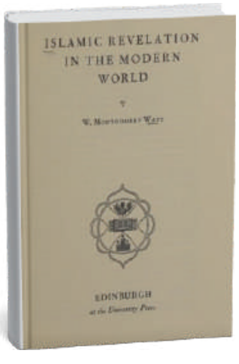

دنیا کی عظیم شخصیات میں سے کسی شخصیت کی اتنی منفی و مسخ شدہ تصویر پیش نہیں کی گئی جیسی محمد ﷺ کی پیش کی گئی۔ اور پھر ہم نے دیکھا کہ یہ کیسے ہوا؟ صدیوں تک اسلام عیسائیت کا دشمن اعظم تھا، عیسائیت کا مسلمانوں کے مقابلے کی کسی دوسری منظم طاقت سے سابقہ نہ تھا۔ بازنطینی سلطنت عربوں کے ہاتھوں اپنے بعض اہم صوبے کھونے کے بعد ایشیا مائنر میں ان کے حملوں کی زد میں تھی، جب کہ مغربی یورپ سپین اور سسلی سے خائف تھا۔ سراسنز (4) کو ارض مقدس سے نکال پھینکنے کی بھرپور صلیبی کوششوں سے بھی پہلے قرون وسطی کا یورپ ایک دشمن اعظم کا تصور تخلیق کر رہا تھا۔ ایک نکتہ وہ تھا جہاں محمد ﷺ کو ماہونڈ یعنی تاریکی کا شہزادہ بنا کر پیش کیا گیا تھا۔ (5)

حضور ﷺ پر لگائے گئے اہل مغرب کے الزامات کو رد کرتے ہوئے واٹ نے لکھا کہ محمد ﷺ نے ایک ایسا روحانی اور سماجی نظام قائم کیا جو آج کی ترقی یافتہ دنیا کے چھٹے حصے کی رہ نمائی کر رہا ہے۔اس کے الفاظ یہ ہیں:

> آپ ﷺ نے معاشرتی تحفظ کا نیا نظام اور نیا خاندانی ڈھانچہ تشکیل دیا، یہ دونوں پہلے سے بہت اصلاح شدہ چیزیں تھیں۔ آپ ﷺ نے ایسا مذہبی و معاشرتی ڈھانچہ قائم کیا جو آج کی دنیا میں نسل انسانی کے چھٹے حصے کی رہ نمائی کا سامان ہے۔ یہ کام کسی دھوکے باز اور مکار آدمی کا نہیں ہو سکتا۔(6)

آپ ﷺ کے اپنے مشن کے لیے سخت تکالیف برداشت کرنے اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما جیسے مضبوط اور صاحب خلق لوگوں کی وفاداری حاصل کرنے میں آپ ﷺ کی کام یابی کو آپ ﷺ کے خلوص و دیانت کے حق میں دلیل ٹھہراتے ہوئے واٹ نے لکھا ہے:

> اپنی ذات اور مشن پر گہرا یقین ہی مکی دور میں (جب کہ سیکولر نقطہ نظر سے کام یابی کا کوئی امکان نہیں تھا) محمد ﷺ کی مشکلات و مصائب کو برداشت کرنے کے لیے آمادگی کی توجیہ کرتا ہے۔خلوص کے بغیر آپ ﷺ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما ایسے اعلیٰ کردار کے حامل افراد کی وفاداری اور عقیدت و محبت کیسے حاصل کر سکتے تھے؟ ایک توحید پرست کے لیے مزید سوال یہ ہے کہ خدا جھوٹ اور دغے کی بنیاد پر اسلام ایسے بڑے مذہب کو پھلنے پھولنے کی اجازت کیوں کر دے سکتا تھا؟(7)

واٹ نے اہل مغرب کو آپ ﷺ کی صداقت و دیانت کو تسلیم کرنے اور آپ ﷺ سے متعلق غلطیوں سے نکلنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا:

> اس طرح ہمیں نہ صرف محمد ﷺ کو دیانت داری اور مقصد کی صداقت کا کریڈٹ دینا چاہیے، بلکہ اگر ہم انھیں سمجھنے کے خواہش مند ہیں؛ اگر ہم اسلاف سے ورثے میں ملی غلطیوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ہر خاص معاملے میں آپ ﷺ کے خلوص پر پختہ ایمان رکھنا چاہیے، تاوقتے کہ اس کے خلاف کوئی ناقابل تردید ثبوت نہیں مل جاتا۔(8)

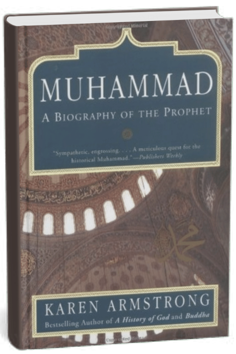

کیرن آرمسٹرانگ (پیدائش ۱۹۴۴) نے The Muhammad Enemy کے تحت اپنی ایک تحریر میں مغرب کی پیغمبر اسلام ﷺ سے دشمنی کی تاریخ پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ مغرب کی تاریخ میں آپ ﷺ کی انتہائی غلط، متعصبانہ اور افسانوی تصویر کشی کی گئی ہے۔اس کے مطابق مغرب میں آپ ﷺ کو اس درجہ فرضی و افسانوی انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ کی تمثیلی حیثیت نے لوگوں کے لیے اس بات کو مشکل بنا دیا ہے کہ وہ آپ ﷺ کو ایک ایسے تاریخی کردار کی شکل میں دیکھیں جو اس طرح کے سنجیدہ سلوک کا مستحق ہے جس کے مستحق نپولین اور سکندر اعظم تھے۔ مصنفہ کے مطابق مغرب میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف قرون وسطی کے مغربی تخیلات کی بازگشت آج بھی سنی جا سکتی ہے۔ شیطانی آیات کا افسانہ انھی کی قبیل سے ہے۔(9)

نبی کریم ﷺ کے ایک اعلیٰ کردار کی حامل شخصیت ہونے کا اعتراف دیگر مستشرقین کے ہاں بھی ملتا ہے۔اس حوالے سے Rom Landau(1899–1974،)Tor Julins Efraim(1885–1947)،Gustar Wail(1805–1889) وغیرہ کی تحریروں کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔(10)

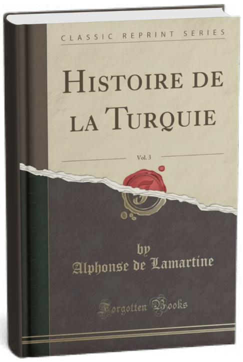

ایک فرانسیسی شاعر اور مصنف لامرطین (1790–1879) نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: تم یہ خیال کرتے ہو کہ محمد ﷺ دھوکے باز اور جھوٹے تھے، ہرگز نہیں، نہ وہ دھوکے باز تھے اور نہ جھوٹے۔جھوٹ، دھوکا اور فریب، یہ سب چیزیں نفاق عقیدہ سے پیدا ہوتی ہیں اور نفاق میں عقیدے کی قوت نہیں، جھوٹ میں سچ جیسی طاقت نہیں۔حضرت محمد ﷺ نے قوم کی برائیوں کو ختم کرنے کے لیے نہایت بہادری اور جرأت سے برس ہا برس تک سخت مخالفت اور طرح طرح کی فحش کلامیوں اور بد زبانیوں کی پرواہ کیے بغیر ایمان ونجات کی دعوت دی اور اپنی کوششوں میں کام یاب رہے۔آپ ﷺ کی دعوت نہ صرف آپ ﷺ کی زندگی میں کام یابی سے پھیلی بلکہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی پھیلتی رہی۔ان سب باتوں سے اس نتیجے پر پہنچنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہتی کہ حضور ﷺ نہ تو دھوکے باز تھے اور نہ باطل پرست۔اس مصنف نے حضور ﷺ کا تعارف کراتے ہوئے لکھا: فلسفی، خطیب، رسول، شارع، قائد، فکرونظر کے دروازے کھولنے والا، انسانوں کو عقل کی طرف راغب کرنے والا ، ایسے عقائد کا مبلغ جو دل اور ذہن دونوں کے موافق ہوں۔ایسے دین کا بانی جس میں بت پرستی کا کوئی شائبہ نہیں، کرہ ارض پر میں مادی سلطنتوں اور ایک عظیم روحانی سلطنت کا بانی؛ یہ ہے محمد ﷺ۔(11)

لامرطین آپ ﷺ کی اس طرح کی مختلف صفات کی شخصیت کی مختلف جہتوں کا ذکر کرنے کے بعد آپ ﷺ کو ایک عدیم المثال انسان قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے:

> ان تمام پیمانوں کے مطابق جن پر انسانی عظمت کو پرکھا جاسکتا ہے، ہم پوچھ سکتے ہیں: کوئی اور انسان ہے جو آپ ﷺ سے بڑھ کر ہو؟(12)

معروف مستشرق ولیم میور(۱۸۱۹-۱۹۰۵) آپ ﷺ کی اخلاقی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے:

> اپنے تمام امور و معاملات میں آپ ﷺ انصاف پسند اور راست رو تھے۔آپ ﷺ کے خوب صورت اور قابل قدر رویے نے تو جوانی ہی میں آپ ﷺ کو ''سچے اور دیانت دار'' کا لقب دلا دیا تھا۔(13)

تھامس کارلائل نے حضور ﷺ کی سیرت طیبہ پر لگائے جانے والے الزامات کی زبردست تردید کی اور آپ ﷺ کو سچا نبی تسلیم کیا۔اس کے بقول حضرت محمد ﷺ کے بارے میں ہم عیسائیوں کا یہ قیاس بالکل بے بنیاد ہے کہ آپ جھوٹے اور دغاباز تھے اور آپ ﷺ کا مذہب محض فریب اور نادانی کا ایک مجموعہ تھا۔کذب و افترا کا وہ انبار جو ہم نے اپنے مذہب کی حمایت میں اس ہستی کے خلاف کھڑا کیا ہے وہ خود ہمارے لیے شرم ناک ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ہم کسی طور پر بھی آپ ﷺ کو حریص، تنگ ظرف اور جھوٹا

کہنے میں حق بجانب نہیں۔ آپ ﷺ صادق تھے اور آپ ﷺ کا الہام بالکل سچا تھا۔(14)

اس نے آپ ﷺ کے خلاف قدیم مغربی تصور کو سختی سے رد اور اس پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا:

> افسوس! میرے خیال میں اس سے بڑھ کر خدا بیزار تصور اس روے زمین پر کبھی اشاعت پذیر نہیں ہوا تھا کہ ایک جھوٹا آدمی ایک مذہب کی بنیاد رکھے؟ ایک جھوٹا شخص اینٹوں کا ایک گھر کیوں نہیں بنا سکتا! اگر وہ پکی مٹی اور مسالے وغیرہ چیزوں اور ان کی ضرورت و استعمال سے صحیح صحیح واقفیت نہیں رکھتا، تو وہ کوئی گھر نہیں ایک ردی سا گھروندا ہی بنائے گا۔ اگر یہ مذہب جھوٹے نبی نے بنایا ہوتا بارہ صدیوں تک برقرار نہیں رہ سکتا کہ ایک سو اسی لاکھ کا مسکن بنے؟ یہ تو ناگہاں گر جائے گا۔(15)

میڈرڈ کے آرچ بشپ نے قرطبہ کی مسیحی مسلم کانگرس ۱۹۷۷ء کی افتتاحی تقریر میں مسیحیوں پر زور دیا کہ وہ ماضی کو بھلا کر پیغمبر اسلام ﷺ کی عزت و تکریم کا رویہ اپنائیں اور آپ ﷺ کی توہین ترک کر دیں۔ اس نے واضح کیا کہ آپ ﷺ کی توہین تاریخی اور مذہبی حقائق کے خلاف ایک جرم ہے۔ آپ ﷺ کی متعارف کروائی ہوئی اخلاقی اقدار کی قدر نہ کرنا اس کانفرنس کے مقاصد سے متصادم ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی تناظر اور علم سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔(16)

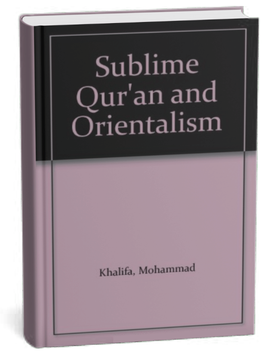

الزام صرع اور اس کی تردید

کبوتر اور اونٹ وغیرہ کی کہانیاں تو اس زمانے کے افسانے ہیں جب حضور ﷺ سے متعلق الزام تراشی کے لیے کسی دلیل اور کسی اسلامی مصدر کے حوالے کی ضرورت محسوس نہ کی جاتی تھی۔ بعد میں جب ایسی الزام تراشیوں کا فضول اور لایعنی ہونا واضح ہو گیا تو حضرت محمد ﷺ کے مغربی ناقدین نے اسلامی مصادر کی بعض روایات کی مضحکہ خیز تعبیرات پیش کر کے آپ ﷺ پر مرگی کے مریض ہونے کا الزام عائد کر دیا۔ انھوں نے کہنا شروع کر دیا کہ محمد ﷺ جس کیفیت کو وحی خیال کرتے تھے وہ دراصل ان کے مرض کا نتیجہ تھی۔ محمد خلیفہ لکھتے ہیں:

> آپ ﷺ پر وحی کی توجیہ میں سان پیڈرو اور قرون وسطی اور بعد کے دیگر مستشرقین کا کہنا ہے کہ آپ ﷺ مرگی کے مریض یا بھوت پریت کے زیرِ اثر تھے۔ حال ہی میں روڈنسن نے آپ ﷺ کی وحی کو ہذیان سے تعبیر کیا ہے۔(17)

مغرب میں آپ ﷺ کے مصروع ہونے کا تصور اس قدر عام اور مقبول رہا ہے کہ قرون وسطی تو ایک طرف جدید دور کے بڑے بڑے معروف اہل قلم بھی اسے ایک ثابت شدہ اور متفق علیہ حقیقت کے طور پر پیش کرتے رہے ہیں۔ گستاو یل لکھتا ہے:

> مشرق و مغرب کے محققین اس نکتے پر متفق ہیں کہ محمد ﷺ کو مرگی کے دورے پڑتے تھے۔(18)

یہی نہیں بلکہ جدید زمانے کا ولیم میور بھی آپ ﷺ پر وحی کی تعبیر مرگی کے دوروں ہی سے کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ بعض اوقات آپ ﷺ کی بے قراری وجد یا کشف کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ ہمیں اس سے متعلق کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں، تاہم کچھ عیسائی مصنفین نے ان کیفیات کو مرگی کے دورے قرار دیتے ہوئے ان کا تعلق آپ ﷺ کے بچپن میں ظاہر ہونے والی

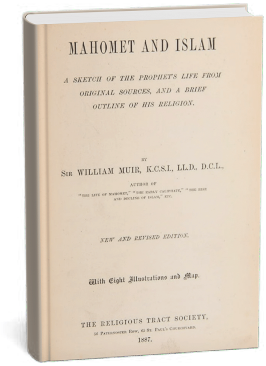

علامات سے جوڑا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی کے آخری حصے میں بھی نزول وحی سے قبل آپ ﷺ پر اس قسم کی غشی اور بیداری کے سپنے کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ اس کے بعد میور اسلامی مصادر میں بیان ہونے والا پہلی وحی کا واقعہ یہ کہتے ہوئے تفصیلاً بیان کرتا ہے کہ قاری خود نتیجہ اخذ کر لے کہ محمد ﷺ کی وحی کس چیز کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ (19) پھر دوسری وحی کا حوالہ دینے کے بعد اسلامی روایات اور اپنے تخیل کو ملا کر کہتا ہے:

روایت کے مطابق پیغمبر ﷺ پر بے قراری غالب آجاتی تھی اور ان کا چہرہ متغیر ہو جاتا تھا۔ ان کی پیشانی سے پانی کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑتے تھے۔ (20)

اب دیکھیے کہ اسلامی روایات میں حضور ﷺ کے چہرے کے متغیر ہونے اور آپ کی پیشانی سے پسینے کے قطرے ٹپکنے کا تو ذکر گبن کے نزدیک حضور ﷺ پر مرگی کی تہمت اس قدر مہمل ہے کہ اس کے خیال میں یہ ان لوگوں کے لیے بھی سخت نقصان دہ ہے، جو آپ ﷺ کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے مطابق آپ ﷺ پر مرگی کے اس بیہودہ الزام سے، جو آپ ﷺ کی ذات پر کسی طرح فٹ نہیں ہو سکتا، الٹا آپ ﷺ کے لیے ترحم کے جذبات پیدا ہوں گے؟ اس کے الفاظ ہیں:

آپ ﷺ پر یونانیوں کی نامعقول تہمت آپ ﷺ کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے بجائے آپ ﷺ کے حق میں محبت و رحمت کے جذبات کا موجب ہوگی۔

ہے لیکن عالم مدہوشی میں زمین پر گر پڑنے کا کسی بھی قابل لحاظ روایت میں کوئی ذکر نہیں۔ یعنی He Would Fall to the Ground as in a Trance محض میور کے تخیل کی کرشمہ سازی ہے، تاکہ مسیحی مصنفین کے ذکر کردہ Epileptic Seizures کو حقیقت باور کرایا جا سکے۔ الزام صرع کے لیے مستشرقین کے مذکورہ نوعیت کی بعض روایات کو اسی طرح عجیب و غریب انداز سے تعبیر اور پیش کرنے کی اور بھی متعدد تعجب خیز مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً انھوں نے آپ ﷺ کو مریض باور کرانے کے لیے آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ کو بھی مریضہ قرار دے دیا اور اس کے لیے دلیل یہ پیش کی کہ روایات کی رو سے حضرت آمنہ کے خوابوں میں فرشتوں کو دیکھنے کا تذکرہ ہے۔ آپ ﷺ کے شق صدر کو بھی یہ دلیل دے کر مرگی سے جوڑا گیا کہ اس موقع پر حضرت حلیمہ اور ان کے شوہر نے بھی یہ سمجھا تھا کہ ان کے رضاعی بیٹے پر مرگی کا حملہ ہوا ہے۔ اس کے لیے دلیل اس روایت کو بنایا گیا:

"قالت و قال لي أبوه يا حليمة لقد خشيت أن يكون هذا الغلام قد أصيب فالحقيه بأهله. (21)

حضرت حلیمہ بجا کہتی ہیں کہ اس کے باپ نے مجھ سے کہا اس لڑکے کو کچھ ہو گیا ہے۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ اسے اس کے گھر والوں کے پاس پہنچا دو۔

اس عبارت سے کسی بھی طرح یہ بات نہیں نکالی جا سکتی کہ حضور ﷺ کے رضاعی ماں باپ نے مصروع ہونے کا شبہ بھی کیا تھا۔ پھر اس عبارت کا مغربی اہل قلم کی جانب سے غلط ترجمہ بھی ہوا اور اسے مختلف الفاظ کے ساتھ بھی پیش کیا گیا۔ مثلاً

قد أصيب فالحقيه بأهله کے الفاظ کو قد أصيب بالحقيه بأهله لکھا گیا اور پھر اس کا ترجمہ کیا گیا:

اس لڑکے نے اپنے کسی ساتھی سے دماغی بیماری اخذ کر لی ہے۔

قرآن کے حکیمانہ بیانات کے تناظر میں الزام صرع کی تردید کرتے ہوئے Rom Landau رقم طراز ہے:

یہ الزام کہ آپ ﷺ کی وحی دراصل مرگی کے دورے تھے، سفید جھوٹ ہے۔ اس لیے کہ اس طرح کے دوروں میں آدمی غیر معمولی حکیمانہ وفاضلانہ بیانات پیش کرنے کے قابل نہیں ہوتا جو ہمیں قرآن یا اس کے مختلف حصوں کی شکل میں ملتے ہیں۔

یہ مختلف عبارت اور اس کا بھی غلط ترجمہ مستشرقین کے ہاں مرجع ہو گیا اور بڑے بڑے مستشرقین کے ہاں اسے آپ ﷺ پر مرگی کے الزام کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ بعد ازاں أصيب کو أسيب بھی قرار دیا گیا اور اسے مرگی کے دورے (Epileptic Fit) سے تعبیر کیا گیا۔ مرگی کے الزام کی ایک دلیل یہ بھی قرار پائی تھی کہ اسلامی روایات میں آتا ہے کہ حضرت حلیمہ نے آپ ﷺ کے سر پر بادلوں کو سایہ کناں دیکھا تھا۔(22)

اس نوع کے مضحکہ خیز استدلالات وتعبیرات سے اس الزام کو آخر کب تک دہرایا جا سکتا تھا؟ بالآخر اہل مغرب کو اس الزام کو بھی سختی سے رد کرنا پڑا اور مغرب کے سنجیدہ اہل علم ونظر کے ہاں اس کی لغویت اس قدر واضح ہو کر سامنے آئی جس قدر آپ ﷺ سے متعلق افسانوی کہانیوں کی لغویت واضح ہوئی تھی۔

مشہور مغربی مورخ ایڈورڈ گبن (۱۷۳۷-۱۷۹۴) نے آپ ﷺ پر مرگی کے الزام کو تھیوفینز، زونارس اور دوسرے یونانیوں کی نامعقول تہمت قرار دیا، جسے ہوٹنگر، پریڈو اور مراقی کے شدید تعصبات نے نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔(23)

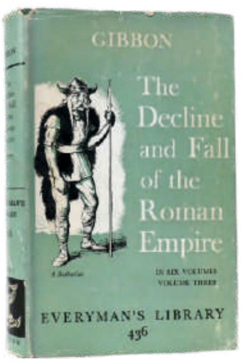

گبن کے نزدیک حضور ﷺ پر مرگی کی تہمت اس قدر مہمل ہے کہ اس کے خیال میں یہ ان لوگوں کے لیے بھی سخت نقصان دہ ہے، جو آپ ﷺ کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے مطابق آپ ﷺ پر مرگی کے اس بیہودہ الزام سے، جو آپ ﷺ کی ذات پر کسی طرح فٹ نہیں ہو سکتا، الٹا آپ ﷺ کے لیے ترحم کے جذبات پیدا ہوں گے؟ اس کے الفاظ ہیں:

آپ ﷺ پر یونانیوں کی نامعقول تہمت آپ ﷺ کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے بجائے آپ ﷺ کے حق میں محبت و رحمت کے جذبات کا موجب ہوگی۔(24)

جدید مغربی اہل قلم کے ہاں حضور ﷺ پر الزام صرع کی تردید زیادہ موثر انداز سے اور وسیع پیمانے پر ملتی ہے۔ اے گیوم

(۱۸۸۸-۱۹۶۶ء) نے اس الزام کو اسلام اور پیغمبر ﷺ کے خلاف تعصب کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے لکھا:

> (مرگی سے متعلق) بہت پہلے کے بازنطینی مصنف کا یہ الزام ایک ایسا مفروضہ ہے جسے نہایت آسانی سے محمد ﷺ کی مخالف تعصب کا شاخسانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔(25)

گیوم آگے چل کر آپ ﷺ کی بے مثل دانش مندی، جنگوں میں حیرت انگیز کامیابی اور سخت ترین مخالفت کے باوجود نہایت عزم و استقلال سے کوششیں جاری رکھتے ہوئے اہل عرب کو اسلام پر مجتمع کر دینے کی شہادتوں کی بنیاد پر الزام صرع کی تردید کرتے ہوئے رقم طراز ہے:

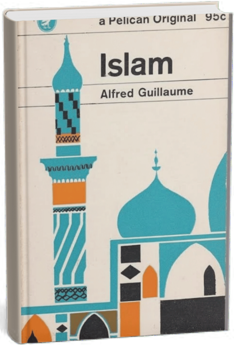

> محمد ﷺ کی عقل و دانش کبھی ماؤف نہیں ہوئی۔ جو لوگ آپ ﷺ کے ذہنی و نفسیاتی استحکام کا انکار کرتے ہیں وہ دوسروں کی غیر معمولی جانچ پرکھ، آپ ﷺ کے زمانے کے حالات کی اہمیت، اور لوگوں کو اسلام پر مجتمع کر دینے تک مسلسل مخالفت کا سامنا کرنے میں آپ ﷺ کے عزم و استقلال کی واضح شہادتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اختلاف و مخالفت، جنگ، سخت و مشکل اقدام کسی بھی موقع پر آپ ﷺ کبھی بھی بد دل یا شکست خوردہ نظر آتے ہیں؟ تمام شہادتیں زیر نظر الزام کے خلاف جاتی ہیں۔ میرے نزدیک آپ ﷺ کو مرگی کا مریض قرار دینا اتنا ہی بے بنیاد ہے جتنا مسلمانوں کے نزدیک جارحانہ و ناپسندیدہ۔(26)

قرآن کے حکیمانہ بیانات کے تناظر میں الزام صرع کی تردید کرتے ہوئے Rom Landau رقم طراز ہے:

> یہ الزام کہ آپ ﷺ کی وحی دراصل مرگی کے دورے تھے، سفید جھوٹ ہے۔ اس لیے کہ اس طرح کے دوروں میں آدمی غیر معمولی حکیمانہ و فاضلانہ بیانات پیش کرنے کے قابل نہیں ہوتا جو ہمیں قرآن یا اس کے مختلف حصوں کی شکل میں ملتے ہیں۔(27)

منٹگمری واٹ نے الزام صرع کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> نزول وحی کے وقت محمد ﷺ کو پیش آنے والی بعض کیفیات، مثلاً آپ ﷺ کا تکلیف اور درد محسوس کرنا، کانوں میں گھنٹی کی سی آواز آنا، سخت سردی کے موسم میں بھی نزول وحی کے وقت آپ ﷺ کی پیشانی سے پسینے کے قطرے ٹپکنا وغیرہ سے مغربی نقادوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ آپ ﷺ مرگی کے مریض تھے، لیکن یہ نظریہ کوئی حقیقی بنیاد نہیں رکھتا۔ مرگی انسان کو ذہنی اور جسمانی طور پر کمزور کر دیتی ہے، لیکن محمد ﷺ میں اس قسم کے کوئی آثار نظر نہیں آتے، اس کے برعکس آپ ﷺ کے تمام ذہنی و جسمانی قوی آخر تک بالکل صحیح سلامت تھے۔(28)

ای۔ ڈرمنگھم نے بھی نہایت پرزور الفاظ میں اس الزام صرع کی تردید کی۔ اس نے لکھا ہے کہ محمد ﷺ اس اعتبار سے دنیا کے واحد پیغمبر ہیں، جن کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ ان کی زندگی کا کوئی گوشہ چھپا ہوا نہیں۔ آپ ﷺ پر کسی ذہنی بیماری کا

الزام صرف عقل سلیم سے عاری انسان ہی عائد کرتے ہیں۔ یہاں موازنہ نہیں بلکہ اظہارِ حقیقت مقصود ہے کہ عہد نامہ قدیم کے پیغمبر ﷺ کتنے مغلوب الغضب تھے اور تو اور عہد جدید میں حضرت مسیح ﷺ جیسے حلیم اور نرم دل کو بھی ہم غصے اور طیش سے مغلوب ہوتے دیکھتے ہیں اور ایسی زبان بھی بولتے سنتے ہیں، جو شائستہ قرار نہیں دی جاسکتی۔کیا محمد ﷺ کا بڑے سے بڑا معترض کوئی ایک بھی ایسا واقعہ بتا سکتا ہے، جب آپ ﷺ نے خود پر غصے اور طیش کو غالب کر دیا ہو؟ کیا کسی ایسے واقعے کی نشان دہی کی جاسکتی ہے،

برطانوی مستشرق آرسی زائنر (۱۹۱۳-۱۹۷۴) نے آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کو ناقابل انکار قرار دیتے ہوئے واضح کیا کہ اس کا اقرار پیغمبران بائبل کی نبوت کے اقرار کا تقاضا ہے۔اگر آپ ﷺ نبی نہیں تو انبیاے بائبل بھی نبی قرار نہیں پاتے۔اس کے مطابق قرآن آپ ﷺ کی رسالت کا واضح ثبوت ہے۔

جب آپ نے غیر شائستہ زبان استعمال کی ہو؟ کوئی معترض اور نقاد بھی آپ ﷺ کی زندگی کا ایک ایسا واقعہ بیان نہیں کر سکتا، جب کسی مرض یا تکلیف کی وجہ سے آپ ﷺ کسی میدان جنگ یا زمانہ امن میں کسی بیماری کے دورے کے زیر اثر آئے ہوں۔کوئی ایسا واقعہ ان کی زندگی میں نہیں ملتا، جس سے ان کی جسمانی یا ذہنی صحت کے علیل ہونے کا سراغ ملتا ہو۔ان کی جسمانی اور ذہنی صحت قابل رشک تھی۔آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں چالیس فوجی مہمیں روانہ کیں جن میں سے ایک اندازے کے مطابق تیس جنگوں میں آپ ﷺ بنفس نفیس شریک ہوئے۔ ہر جنگ میں جس فراست، جس شجاعت اور جنگی حکمت عملی اور مہارت کا ثبوت آپ ﷺ نے فراہم کیا، کیا وہ کسی ایسے شخص کے لیے ممکن ہو سکتا ہے، جو کسی بھی نوع کی بیماری میں مبتلا ہو؟ محمد ﷺ کی پاک، صحت منداور توانا شخصیت کو بیمار کہنے والے درحقیقت خود ذہنی بیماری میں مبتلا ہیں۔(29)

جدید مغربی اہل قلم نے آپ ﷺ پر مرگی کے الزام کو اس سختی سے رد کیا کہ اسے تاریخی تنقید کے خلاف ایک گناہ کا ارتکاب قرار دیا۔اے گیوم لکھتا ہے:

> گذشتہ نسلوں کے برعکس جدید تر مصنفین نے مرگی کے نظریے کی مخالفت کی ہے۔محض افسانے کی بنا پر قائم ہونے والے اس نظریے کی کوئی تاریخی بنیاد نہیں۔ یہ تاریخی تنقید کے خلاف ایک جرم کا ارتکاب ہے۔(30)

حالات کے فطری ردعمل کا نظریہ اور اس کا ابطال

جب وحی سے متعلق مرگی اور صرع کا الزام اس درجہ لغو ثابت ہو گیا کہ اسے تاریخی تنقید کے خلاف جرم و گناہ کا ارتکاب قرار دیا جانے لگا اور جدید تعلیم یافتہ مغرب میں اس الزام کو دہرانا یا اس پر دلائل لانا ایک فضول و جاہلانہ تصور قرار پایا تو اہل مغرب کے ہاں وحی محمدی ﷺ کی یہ جدید فلسفیانہ تعبیر سامنے آئی کہ حضور ﷺ جن خیالات و تصورات کو وحی کی حیثیت سے پیش کرتے تھے، وہ آپ ﷺ اپنے لاشعور سے ابھرے تھے۔یعنی آپ ﷺ کی وحی کوئی وحی آسمانی نہیں تھی، اپنے زمانے کے دگرگوں حالات کو سنوارنے اور

اہل عرب کے جاہلانہ وظالمانہ نظام زندگی کو عادلانہ نظام میں ڈھالنے سے متعلق آپ ﷺ کی تڑپ اور لگن کا نتیجہ تھی۔ بہ الفاظ دیگر آپ ﷺ کی وحی آپ ﷺ کے اصلاحی ومصلحانہ افکار تھے، جن کو آپ ﷺ نے غلطی سے وحی سمجھ لیا تھا۔وحی محمدی ﷺ کی یہ فلسفیانہ توجیہ عصر حاضر کے بڑے بڑے نام ور مستشرقین کی طرف سے پیش کی گئی ہے۔اس ضمن میں بیسویں صدی کا مشہور مستشرق منٹگمری واٹ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔اس کا کہنا ہے:

> کوئی نیا مذہب کسی ضروری محرک کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہوسکتا۔محمد ﷺ اور آپ ﷺ کے اولین پیروکاروں کے معاملے میں بھی یقینی ضرورت رہی ہوگی جسے ترقی پذیر مذہب کے عقائد ورسوم کے ذریعے پورا کیا گیا۔(31)

وحی محمدی ﷺ کو آپ کی اندرونی کیفیت سے تعبیر کرنے کے ضمن میں ایک جگہ واٹ کا پیش کردہ یہ تصور بھی قابل ذکر ہے:

> اکثر وبیش تر مذہبی افکار اجتماعی لاشعور (collective unconscious) سے شعور میں آنے والے تصورات ہیں اور مذہبی رسوم ان کے نظریات کا شعوری جواب۔(32)

مسٹر واٹ وضاحت کرتے ہیں کہ مذکورہ تصور کے مطابق یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے مشمولات سب کے سب collective unconscious سے ابھرے ہیں۔گویا خارج سے کوئی وحی نازل نہیں ہوئی، سب مذاہب اپنے زمانے کے حالات وواقعات کا فطری ردعمل ہیں۔(33) رہی یہ بات کہ حضور ﷺ کا کہنا تو یہ تھا کہ مجھ پر خارج سے بذریعہ جبریل وحی نازل ہوتی ہے تو اس کی توجیہ یوں کی گئی کہ محمد ﷺ کو اپنے کام میں مخلص سمجھا جاسکتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ ﷺ اپنے عقائد میں صحیح راستے پر تھے۔ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی مخلص ہو باایں ہمہ وہ غلط راستے پر ہو۔ممکن ہے آدمی بعض خیالات کو خارج سے آتا ہوا محسوس کرے، لیکن درحقیقت وہ اس کے اپنے ہی لاشعور سے ابھرے ہوں۔واٹ کے الفاظ ہیں:

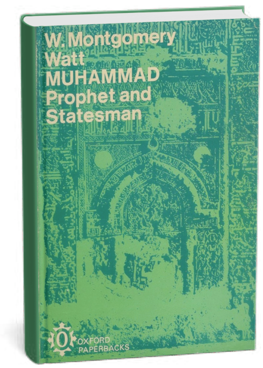

> یہ کہنا کہ محمد ﷺ مخلص تھے، یہ معنی نہیں رکھتا کہ آپ اپنے عقائد میں صحیح بھی تھے۔آدمی مخلص ہونے کے باوجود غلطی پر ہوسکتا ہے۔ جو چیز آدمی کو خارج سے آتی ہوئی محسوس ہو وہ فی الواقع اس کے اپنے لاشعور کی آواز بھی ہوسکتی ہے۔(34)

آپ ﷺ کی کام یابی کو وقت کے تقاضے اور ماحول کی سازگاری سے جوڑنے کی کوشش میں واٹ اگرچہ بہت نمایاں ہیں لیکن اس ضمن میں یہ اکیلے نہیں، اور بھی متعدد مغربی اہل قلم نے اپنے اپنے انداز سے یہ نظریہ پیش کیا ہے۔مثلاً ولیم میور پیغام محمدی ﷺ کی اشاعت کو احوال وظروف کی موافقت سے یوں جوڑتا ہے کہ آپ ﷺ کا پیغام یہودیت کے مقابلے میں مدینے میں اس بنا پر تیزی سے پھیلا کہ یہودیت بدیسی تھی اور اسلام اہل عرب کے نظریات، رسوم ورواجات اور تخیلات وتوہمات کے مطابق تھا۔وہ لکھتا ہے:

> حالات اتنے سازگار تھے اور دعوت وتبلیغ اتنی پرجوش تھی کہ اسلام گھر گھر اور قبیلہ قبیلہ پہنچ گیا۔یہودی حیرت زدہ تھے، جن لوگوں کو بت پرستی سے نکالنے کے لیے ان کی زمانوں کی محنت کارگر نہ ہوسکی تھی، اب وہ بتوں کو پھینک کر توحید خداوندی کا اقرار کر رہے

تھے۔کام یابی کاراز آلے کے صحیح استعمال میں مضمر تھا۔اسلام مقامی ماحول اور مزاج سے ہم آہنگ تھا۔یہودیت اپنی اصل کے اعتبار سے بدیسی تھی،لہٰذا وہ عربوں کی ہم دردیاں حاصل نہ کرسکی۔اسلام عربوں کے عقائد ونظریات،توہمات اور رسوم و رواجات پر مبنی تھا،سووہ جلد ہی ان کے دلوں میں جاگزیں ہوگیا۔(35)

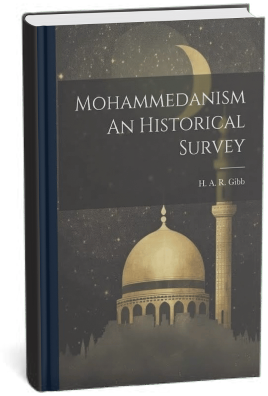

ایچ۔اے۔آر۔گب (۱۸۹۵-۱۹۷۱) نے کہا کہ حضور ﷺ کی کام یابی اور طلوع اسلام دراصل مکہ اور مدینہ میں آپ ﷺ کی سخت مخالفت کا ردعمل ہے۔اس کے الفاظ ہیں:

محمد ﷺ ابتدا میں شعوری سطح پر نئے دین کے داعی نہ تھے،یہ اہل مکہ کی مخالفت اور دشمنی تھی جس نے آپ ﷺ کو رفتہ رفتہ اس پر مجبور کیا۔بعدازاں مدینے میں آپ ﷺ کی مخالفت ممتاز عقیدے کے حامل ایک نئے مذہبی معاشرے کے ظہور پر منتج ہوئی۔(36)

لیکن وحی محمدی ﷺ کی حالات کی موافقت وسازگاری وغیرہ کی اس جدید فلسفیانہ توجیہ کی بھی اہل مغرب کی جانب سے تردید سامنے آگئی۔یہاں تک کہ زیرنظر نظریے کے ضمن میں سب سے نمایاں مستشرق مسٹر واٹ نے بھی بالآخر یہ تسلیم کرلیا کہ آپ ﷺ کی وحی آپ ﷺ کے ذاتی افکار نہیں بلکہ اللہ تعالی کی طرف سے بھیجی ہوئی تعلیم تھی۔انہوں نے Companion to the Quran کے نظرثانی شدہ ایڈیشن کے دیباچے میں لکھا ہے کہ گو میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا تھا کہ محمد ﷺ صدق دل سے اپنے اوپر وحی الٰہی کے قائل تھے،تاہم مجھے ایک عرصے تک آپ ﷺ کو پیغمبر تسلیم کرنے میں تامل رہا،اب البتہ میں یہ علی الاعلان کہتا ہوں کہ آپ ﷺ عہدنامۂ قدیم کے پیغمبروں کی طرح پیغمبر تھے۔وہ مختلف قصص قرآنی کا قصص بائبل سے تقابل کرکے واضح کرتے ہیں کہ قصص قرآنی کو بائبل کی بعینہٖ نقل قرار دینا کسی بھی طرح درست نہیں۔قصص بائبل اور قرآنی قصص میں اس نوعیت کا بنیادی اختلاف ہے کہ اس کی توجیہ بغیر اس کے کوئی نہیں ہوسکتی کہ محمد ﷺ پر عہدنامۂ عتیق کے انبیا کی مانند وحی آتی تھی۔البتہ عہد نامہ قدیم کے پیغمبر اپنے اپنے ادوار کے مذاہب کو ہدف تنقید بناتے تھے اور محمد ﷺ کا مقصد بعثت ان لوگوں کو ایمان باللہ کی دعوت دینا تھا جو کسی بھی دین کو ماننے کے روادار نہ تھے۔اس دیباچے میں واٹ نے مشہور مستشرق مترجم قرآن آرتھر جے آربری کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ مسٹر آربری بھی حضور پر وحی الٰہی کے قائل تھے۔مسٹر واٹ لکھتے ہیں کہ آربری نے اپنا ترجمۂ قرآن اس زمانے میں کیا جب وہ ذاتی نوعیت کی پریشانیوں اور مسائل سے دوچار تھے۔ترجمے کی تکمیل کے بعد انھیں سکون قلب اور اطمینان کی دولت میسر آئی جس پر انھوں نے شکریے کا اظہار کیا اور واضح کیا کہ یہ شکریہ وہ اس قوت مطلقہ کا ادا کر رہے ہیں جس نے نبی ﷺ پر وحی نازل فرمائی۔(37)

آپ ﷺ کے پیرووں پر آپ ﷺ کی تعلیمات کے ظاہر و باہر اثرات،لاکھوں لوگوں کی زندگیوں میں مثبت تبدیلی کے ظہور اور قرآن میں وارد ہونے والے حقائق کے تناظر میں آپ ﷺ کے سچا نبی ہونے پر دلیل لاتے ہوئے واٹ نے ایک جگہ لکھا:

خدا کی بندگی کے دعوے کے ساتھ ایک مذہبی معاشرہ تشکیل پذیر ہوا،جس کی تعداد محمد ﷺ کے عین حیات ہزاروں اور اب کئی سو

مبلین ہے۔اس معاشرے میں حیات طیبہ کے لیے معیارِ زندگی مجموعی طور پر قابل اطمینان رہا ہے،اور لاتعداد لوگ مشکل حالات میں نفیس اور معتدلانہ خوش کن زندگی گزارنے کے اہل رہے ہیں۔یہ نکات اس نتیجے پر پہنچاتے ہیں کہ قرآن میں پیش کردہ تصور حقیقت سچائی پر مبنی اور من جانب اللہ ہے اور محمد ﷺ ایک سچے پیغمبر ہیں۔(38)

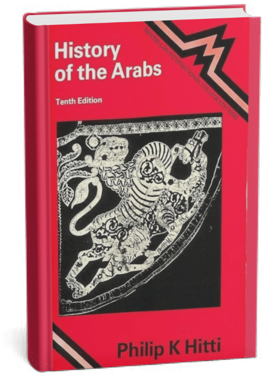

واٹ سے پہلے کے کئی اور مصنفین کے ہاں بھی اس حقیقت کا اعتراف پایا جاتا ہے۔مثلاً فلپ کے۔ہٹی (۱۸۶۰-۱۹۷۸) نے حضور ﷺ کو عہد نامہ قدیم کے پیغمبروں کی طرح سچا پیغمبر تسلیم کرتے ہوئے لکھا:

اپنی دعوت اور پیغام کے اعتبار سے محمد عربی ﷺ اسی طرح سچے نبی تھے جیسے عہد نامہ قدیم کے عبرانی انبیا۔(39)

برطانوی مستشرق آرسی زائنر (۱۹۱۳-۱۹۷۴) نے آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کو ناقابل انکار قرار دیتے ہوئے واضح کیا کہ اس کا اقرار پیغمبران بائبل کی نبوت کے اقرار کا تقاضا ہے۔اگر آپ ﷺ نبی نہیں تو انبیاے بائبل بھی نبی قرار نہیں پاتے۔اس کے مطابق قرآن آپ ﷺ کی رسالت کا واضح ثبوت ہے۔زائینر کے الفاظ ہیں:

کوئی پیمانہ نہیں جس کی بنا پر تحفہ نبوت آپ ﷺ سے روکا جاسکے، جب تک کہ اسے عہد نامہ قدیم کے انبیا سے بھی نہ روک لیا جائے۔قرآن رسالت کا جوہر ہے۔اس میں آپ کو کسی بھی دوسری کتاب سے بڑھ کر ایک ایسی قادرِ مطلق ہستی کا احساس ہوتا ہے جو خود سے غافل لوگوں کو اپنا تعارف کروا رہی ہے۔(40)

انی بیسنت (۱۸۴۷-۱۹۳۳)(41) نے حضور ﷺ کی حیات و تعلیمات پر اپنے لیکچر میں آپ ﷺ کے پیغمبر خدائے عظیم اور بہت زیادہ قابل عزت وستایش ہونے کا اقرار کرتے ہوئے کہا:

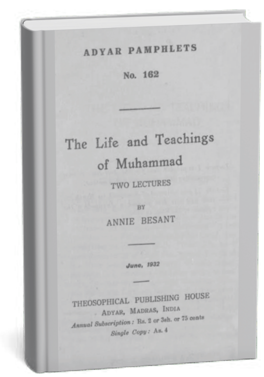

جو شخص بھی عظیم پیغمبر عربی ﷺ کی حیات و تعلیمات کا مطالعہ کرتا ہے، جو جانتا ہے کہ آپ ﷺ نے کیسے تعلیم دی اور کیسے زندگی گزاری، اس کے لیے ناممکن ہے کہ وہ خدائے عظیم کے اس عظیم پیغمبر کی عزت و توصیف کی بجائے کچھ اور محسوس کرے۔میں آپ لوگوں سے بہت کچھ ایسی چیزیں عرض کرنے جا رہی ہوں جو ممکن ہے آپ میں سے بہت سوں کے لیے اجنبی نہ ہوں لیکن میرا اپنا احساس یہ ہے کہ میں جب بھی ان کا بار دگر مطالعہ کرتی ہوں، اس عظیم عربی معلم کے لیے اپنے اندر نئی مدح و ستایش اور نئی عزت و عظمت محسوس کرتی ہوں۔(42)

جدید مغرب میں بعض آوازیں ایسی بھی اٹھ رہی ہیں جو اسلام کی درست تفہیم اور اہل اسلام سے مکالمے کی غرض سے مسیحیوں کو آپ ﷺ کی نبوت کو قانونی (Official) سطح پر تسلیم کرنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔اول الذکر مقصد کے لیے آپ ﷺ کی شخصیت کو مسلمانوں ہی کی مانند پاکیزہ تصور کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے نارمن ڈینیل رقم طراز ہے:

عیسائیوں کے لیے ضروری ہے کہ محمد ﷺ کو ایک مقدس شخصیت کا درجہ دیں، آپ ﷺ کو اسی طرح دیکھیں جیسے مسلمان دیکھتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو وہ خود کو مسلمانوں سے الگ کرلیں گے۔(43)

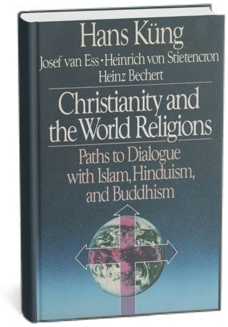

سوئس کیتھولک مسیحی عالم دینیات ہنس کن (پیدائش ۱۹۲۸) کے مطابق اگر کیتھولک اور دیگر چرچ اہل اسلام سے مکالمے کے خواہش مند ہیں تو انھیں محمد ﷺ کی نبوت کو رسمی طور پر (Officially) تسلیم کرنا چاہیے۔(44) مسیحی مسلم مکالمے کے عمل میں شریک تمام عیسائیوں کے حضور ﷺ کو نبی برحق تسلیم کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے ہنس کن نے کہا:

جو مسیحی مسلمانوں سے مکالمے کا خواہش مند ہوتا ہے وہ شروع ہی میں جناب مسیح پر پختہ اور غیر متزلزل اعتقاد رکھتا ہے۔ اسے محمد ﷺ کے کردار کو بھی پوری سنجیدگی سے سچے نبی کے طور پر لینا چاہیے۔(45)

ہنس کن یہودیت، عیسائیت اور اسلام تینوں کو ایک ہی ماخذ سے ماخوذ اور روحی خداوندی پر مبنی باور کراتے ہوئے اس رویے کو سخت تعصب کا شاخسانہ قرار دیتا ہے کہ پیغمبران بائبل کو تو نبی تسلیم کیا جائے لیکن محمد ﷺ کی نبوت کا اقرار نہ کیا جائے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

کیا تینوں مذاہب، یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی اصل ایک ہی نہیں؟ کیا ان مذاہب میں واضح اور بلند آہنگ سے ایک ہی خدا نہیں بول رہا؟ کیا عہدنامہ قدیم کا ''خدا کہتا ہے'' قرآن کے ''کہو'' سے مشابہ نہیں، جیسے کہ عہدنامہ قدیم کا ''جاؤ اور بتاؤ'' قرآن کے ''اٹھو اور ڈراؤ'' سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہ سخت تعصب ہے کہ ہم عیسائی آموس، حوزیہ، اشعیا اور ارمیا کو تو نبی مانیں۔ لیکن محمد ﷺ کی نبوت کا انکار کریں۔(46)

کلیسائے یورپ کے زیر انتظام سالزبرگ میں منعقد ہونے والی مسیحی۔مسلم کانفرنس (۱۹۸۴) میں واضح کیا گیا کہ:

مسیحی عہدنامہ قدیم کے سلسلہ انبیا کا احترام کرتے ہیں۔ یہ انبیا لوگوں کو خدا کی بندگی کی دعوت دیتے تھے۔ محمد ﷺ کو جھوٹا نبی قرار دے کر اس سلسلے سے نکالنا ناانصافی ہے۔ مسیحیوں کو اس میں کوئی مضایقہ نہیں کہ وہ آپ ﷺ کو اسی سلسلہ انبیا کی ایک کڑی مانیں، ماضی میں بعض نے ایسا کیا ہے(47)

نبوت محمدی ﷺ کی آفاقیت کی مخالفت اور اس کا دفاع

عصر حاضر کے بہت سے نمایاں مستشرقین اور سیرت پر لکھنے والے مغربی اہل قلم اس نتیجے پر تو پہنچ چکے ہیں کہ حضور ﷺ اللہ کے پیغمبر تھے لیکن انھوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ آپ ﷺ صرف اہل عرب کی ہدایت کے لیے آئے تھے، باقی دنیا آپ ﷺ کی مخاطب نہیں۔ وہ اس ضمن میں بعض قرآنی آیات اور دیگر اسلامی روایات سے استدلال کرکے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ آپ ﷺ ان لوگوں ہی کے لیے نبی تھے جن میں پہلے کوئی نبی نہیں آیا تھا۔ یہود و نصاری، جن کے پاس پہلے ہی تسلسل کے ساتھ رسول آتے رہے اور جن کے پاس خدائی پیغام اور ہدایت موجود ہے، ان کو پیغام حق پہنچانا نہ آپ ﷺ کی ذمے داری تھی اور نہ

آپ ﷺ نے ایسا کیا۔ یہ تصور عصر حاضر کے ان مغربی مصنفین کے ہاں بہت عام ہے جو عموماً آپ ﷺ کے ہمدردانہ و غیر جانب دارانہ مطالعے کے لیے معروف ہیں، اور مختلف مغربی الزامات سے آپ ﷺ کا دفاع کرتے ہیں، مثلاً منٹگمری واٹ، کیرن آرمسٹرانگ اور کارل ارنسٹ وغیرہ۔ منٹگمری واٹ آپ ﷺ کی نبوت کو عہد نامہ قدیم کے پیغمبروں کی نبوت سے تشبیہ دے کر آپ ﷺ کو اہل عرب کا نبی باور کراتے ہوئے لکھتا ہے:

> میرے نزدیک اس حقیقت کی یہی معقول توجیہ ہے کہ محمد ﷺ کو اسی طرح خدا کی جانب سے وحی آتی تھی جیسے عہد نامہ قدیم کے انبیا کو۔ مزید برآں جہاں موخر الذکر بالعموم پہلے سے موجود اور زیر عمل مذہب کی تنقیح کے ذمے دار تھے محمد ﷺ کا مشن ان لوگوں کو خدا کا یقین دلانا تھا جن کے پاس قبل ازیں کوئی مذہب نہ تھا۔(48)

اسلام اور نبوت محمدی ﷺ کے تمام اہل عالم کے لیے ہونے اور حضور ﷺ کی اس ضمن میں کوششوں کے شواہد اس قدر واضح ہیں کہ ان کو جھٹلانا بھی تعصب یا کم از کم قرآن وسنت اور دیگر اسلامی مصادر سے صرف نظر کیے بغیر ممکن نہیں۔

اسی خیال کا اظہار کرتے ہوئے واٹ نے ایک دوسرے مقام پر لکھا:

> محمد ﷺ عہد نامہ قدیم کے انبیا کی مانند نبی تھے، اگرچہ آپ ﷺ کا کام کچھ مختلف تھا۔ عہد نامہ قدیم کے نبی اصلاً موجود مذہب میں راہ پا جانے والے انحرافات کی اصلاح کرنے والے تھے، جب کہ محمد ﷺ کو ایسے لوگوں کو خدا اور اس کے احکام کی پہچان کرانا تھی جن کے پاس اس نوع کی کوئی معلومات موجود نہ تھیں۔(49)

کارل ارنسٹ یہ وضاحت کرتے ہوئے کہ ابتدا میں اہل اسلام نے یہود و نصاری سے اسلام لانے کا کوئی مطالبہ نہیں کیا، لکھتا ہے:

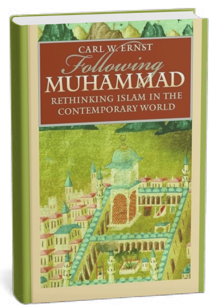

> ایسا کبھی کوئی مطالبہ نہیں تھا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کو دائرہ اسلام میں داخل ہونا چاہیے۔(50)

کیرن آرمسٹرانگ نہایت قطعیت سے دعوی کرتی ہے:

> ایسی کوئی شہادت نہیں کہ محمد ﷺ نے اسلام کو ایک ایسے آفاقی مذہب کی صورت میں دیکھا، جسے اہل کتاب کی وحیوں کی جگہ لینی تھی۔ یہ محض بنی اسمعیل کا مذہب تھا، جیسا کہ یہودیت بنی اسرائیل کا مذہب تھی۔(51)

لیکن مغرب کا آفاقیت محمدی ﷺ کا یہ انکار بھی کسی مضبوط علمی دلیل پر مبنی نہیں۔ آپ ﷺ کی آفاقیت کے حق میں نہایت قوی اور قطعی دلائل موجود ہیں۔ مغربی اہل علم ان پر غور کریں گے تو انھیں اپنے اس موقف پر ضرور نظر ثانی کرنا پڑے گی کہ آپ ﷺ صرف اہل عرب کے نبی تھے یا آپ ﷺ اپنی دعوت کو صرف یہیں تک محدود سمجھتے تھے۔ جن اہل مغرب نے اس حقیقت پر غور کیا ہے ان کے ہاں اس کا اقرار و اعلان ملتا بھی ہے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تصور آفاقیت ابھی موجودہ سنجیدہ مغربی اہل علم

وتحقیق کے ہاں پورے طور پر آشکار نہیں ہوسکا۔ یہاں ہم کوشش کریں گے کہ آپ ﷺ کی آفاقیت پر مغربی مصادر سے سامنے آنے والے دلائل سے قبل چند گزارشات پیش کر دیں۔

اسلام اور نبوت محمدی ﷺ کے تمام اہل عالم کے لیے ہونے اور حضور ﷺ کی اس ضمن میں کوششوں کے شواہد اس قدر واضح ہیں کہ ان کو جھٹلانا بھی تعصب یا کم از کم قرآن وسنت اور دیگر اسلامی مصادر سے صرف نظر کیے بغیر ممکن نہیں۔ یہ سوال کہ حضرت محمد ﷺ نے یہودیوں اور عیسائیوں کو دعوت اسلام نہیں دی اور آپ ﷺ اسلام کو اہل کتاب وغیرہ کا نہیں محض عربوں کا دین خیال کرتے تھے، قرآن وحدیث اور تاریخی حقائق کے سراسر خلاف ہے۔ یہ حقائق بتاتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مختلف اوقات میں اہل

> قرآن میں حضور ﷺ کی آفاقیت پر ایک اہم دلیل یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کے علاوہ تمام انبیا نے اپنی اپنی اقوام کو دعوتِ حق پیش کی اور آفاقیت کا دعویٰ نہیں کیا۔ سورۃ الشعراء میں متعدد انبیا کی اپنی اقوام کو دعوت کا ذکر ہے اور ان کے انداز تخاطب سے بالکل عیاں ہے کہ ان کی دعوت اپنی اپنی قوم تک محدود تھی۔(60) انجیل بھی اس حقیقت پر شاہد ہے، مثال کے طور پر حضرت عیسیٰؑ کا بیان ہے:
>
> میں تو فقط بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی طرف بھیجا گیا تھا۔ بچوں کی روٹی کتوں کے آگے ڈالنا روا نہیں۔

کتاب کو بھرپور انداز سے دعوت اسلام دی۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں اس دعوت کا ذکر ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ. (آل عمران: 64)

کہیے! اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔ پھر اگر وہ (اس دعوت کو قبول کرنے سے اعراض کریں تو تم کہو! گواہ رہو کہ ہم تو اللہ کے حضور سر تسلیم خم کرنے والے ہیں۔(52)

ایک اور مقام پر فرمایا گیا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ آمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُم مِّن قَبْلِ أَن نَّطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَىٰ أَدْبَارِهَا أَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ السَّبْتِ ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا (النساء: 47)

اے وہ لوگو جن کو کتاب دی گئی ہے! اس کتاب پر ایمان لے آو جو ہم نے (حضرت محمد ﷺ پر) نازل کی ہے، جو اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو تمھارے پاس ہے۔ اس سے قبل کہ ہم چہرے بگاڑ کر پیچھے پھیر دیں یا ان کو لعنت زدہ کر دیں جس طرح سبت والوں کو لعنت زدہ کیا تھا۔ اور اللہ کا حکم تو ہو کر رہتا ہے۔(53)

حیرت ہے یہ اور اس نوع کی دیگر متعدد آیات (جن میں صریحاً اہل کتاب کو دعوت اسلام کا ذکر ہے) کے ہوتے ہوئے،

بڑے بڑے نام وراور معروضی طرزِ فکر وتحقیق کے لیے معروف مغربی اہل قلم کیسے یہ دعویٰ کر دیتے ہیں کہ آپ ﷺ نے صرف اہل عرب کو دعوت اسلام دی اور یہود و نصاریٰ سے اس ضمن میں کوئی تعرض نہیں کیا؟

قرآن حکیم کی ان واضح شہادتوں کے علاوہ کتب سیرت میں بھی نبی اکرم ﷺ کی طرف سے یہودیوں کو دعوت اسلام کے کئی شواہد ملتے ہیں، جن میں کچھ مکتوبات کی شکل میں موجود ہیں۔ڈاکٹر حمید اللہ کے مطابق سیرت ابن ہشام میں بنی قنیقاع سے تعلقات کے سلسلے میں جو تبلیغی انداز ہے، قدیم ترین معلوم ہوتا ہے۔اس میں ان کو آپ ﷺ حلف دے دے کر پوچھتے تھے کہ کیا توریت میں میری پیش گوئی نہیں ہے۔اگر تم قسم کھا کر کہو کہ نہیں ہے تو پھر تم سے کوئی مواخذہ نہیں۔اسی مفہوم کا ایک مکتوب نبوی ﷺ بھی ملتا ہے، جو خیبر کے یہودیوں کے نام ہے۔اس میں ان کو خدا کی نعمتیں یاد دلائی گئی ہیں اور توریت کی بشارتوں کے مصداق پر ایمان لانے کی دعوت یہی کہہ کر دی گئی ہے کہ اگر واقعی توریت میں ذکر نہ ہو تو پھر تم سے کوئی خصوصی مطالبہ نہیں۔غالباً یہ مکتوب بھی اس زمانے کا ہے اور خصوصی قاصد کے ذریعے سے خیبر بھیجا گیا تھا، مگر اس کا کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔بنو قینقاع کے یہودیوں نے ایک مسلمان عورت کی بے حرمتی کی۔جس پر کچھ کشت وخون ہوا۔رسول اکرم ﷺ کی سیاست یہ تھی کہ ہر چیز پر تبلیغ دین مقدم رہے۔چناں چہ اس عہد شکنی اور فساد کے سلسلے میں بھی آپ ﷺ نے ان کے پاس جا کر انھیں (پہلے) اسلام لانے کی دعوت دی۔(54)

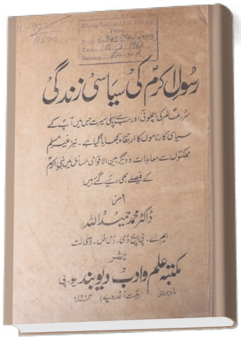

قرآن کریم اور کتب سیرت کے اس قبیل کے شواہد کے پیش نظر یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ نبی اکرم ﷺ یہود مدینہ کو مسلسل دعوت اسلام دیتے رہے۔البتہ یہودیوں کی طرف سے اس دعوت کا جواب اکثر و بیشتر محض سازشوں، بدعنوانیوں، جعل سازیوں اور آیات الٰہی کو جھٹلانے و چھپانے ہی کی شکل میں دیا گیا، چناں چہ قرآن نے کئی مقامات پر آپ ﷺ اور اہل اسلام کی یہودیوں سے متعلق خواہش و کوشش قبول اسلام اور یہودیوں کے مذکورہ نوعیت کے رویوں کا ذکر کیا ہے۔مثلاً ایک مقام پر فرمایا:

أَفَتَطْمَعُونَ أَن يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِن بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ. وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُم بِهِ عِندَ رَبِّكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ. أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ. (البقرۃ:75-77)

کیا پھر تم امید رکھتے ہو کہ وہ تمھارے کہنے پر ایمان لے آئیں گے، حالاں کہ ان میں ایک گروہ ایسا ہے جو اللہ کا کلام سنتے ہیں پھر اس کو سمجھ لینے کے بعد جان بوجھ کر اس میں تحریف کر دیتے ہیں۔اور جب یہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لائے۔اور جب ایک دوسرے کے ساتھ تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: کیا تم انہیں وہ کچھ بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر ظاہر کیا ہے تا کہ وہ اس کے ذریعے تمھارے اوپر تمھارے رب کے سامنے دلیل لائیں، کیا تم سمجھتے نہیں؟ کیا یہ نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جو

کرتے ہیں۔(55)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوا:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ. (آل عمران:98)

کہیے! اے اہل کتاب! تم کیوں اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہو؟ اور اللہ، جو کچھ تم کر رہے، دیکھ رہا ہے۔(56)

جہاں تک مغربی اہل قلم کے اس خیال کا تعلق ہے کہ آپ ﷺ کا مذہب اور پیغام آفاقی و عالم گیر نہیں تو یہ بھی اسی نوع کا ایک باطل خیال ہے جیسا کہ یہود و نصاری کو دعوت اسلام نہ دینے کا، اس لیے کہ اس کے خلاف بھی اسی قبیل کے واضح اور روشن دلائل ہیں۔ قرآن کی بہت سی آیات نبوت و دعوت محمدی ﷺ کی عالم گیریت و آفاقیت پر مہر تصدیق ثبت کر رہی ہیں۔ مثلاً ایک آیت مبارکہ ہے: وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ. (الأنبياء:107) اور ہم نے آپ ﷺ کو سارے جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔(57) ایک اور مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ. (السبا:28) ہم نے

> زندگی کے تمام گوشوں پر محیط مسائل کے حل کے لیے جس قدر حضور ﷺ کی تعلیمات چودہ سو سال سے زائد عرصے سے رہ نمائی کر رہی ہیں، وہ بھی آپ ﷺ کی دعوت کے آفاقی ہونے پر ایک بہت بڑی دلیل ہے۔

آپ ﷺ کو تمام لوگوں کے لیے خوش خبریاں سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔(58) ایک آیت قرآنی ہے: قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا. (الأعراف:158) آپ ﷺ کہہ دیجیے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔(59)

یہ آیات رسالت محمدی ﷺ کی عالم گیریت کے اثبات میں بالکل واضح ہیں۔ جو رسول تمام جہانوں کے لیے رحمت ہو، تمام بنی نوع انسان کی طرف بھیجا گیا ہو اور سب کے لیے بشیر و نذیر ہو اس کو صرف عرب تک محدود کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

قرآن میں حضور ﷺ کی آفاقیت پر ایک اہم دلیل یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کے علاوہ تمام انبیا نے اپنی اپنی اقوام کو دعوتِ حق پیش کی اور آفاقیت کا دعوی نہیں کیا۔ سورۃ الشعراء میں متعدد انبیا کی اپنی اقوام کو دعوت کا ذکر ہے اور ان کے انداز تخاطب سے بالکل عیاں ہے کہ ان کی دعوت اپنی اپنی قوم تک محدود تھی۔(60) انجیل بھی اس حقیقت پر شاہد ہے، مثال کے طور پر حضرت عیسیؑ کا بیان ہے:

میں تو فقط بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی طرف بھیجا گیا تھا۔ بچوں کی روٹی کتوں کے آگے ڈالنا روا نہیں۔(61)

جو آدمی آپ ﷺ کو پیغمبر خدا مانے وہ لازماً قرآن کو کلام الٰہی تسلیم کرے گا اور قرآن کو کلام الٰہی ماننے والا آپ کی نبوت کی آفاقیت کو کسی طور نہیں جھٹلا سکتا؛ اس لیے کہ قرآن اس پر نہایت واضح ہے، آپ ﷺ کے کام کی آفاقیت کی تکذیب قرآن کی تکذیب

کے بغیر ممکن نہیں۔لہذا آپ کو نبی اور قرآن کو کلام الٰہی مان لینے والے اہل مغرب کے پاس آپ ﷺ کی آفاقیت کے انکار کا کوئی جواز نہیں۔علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی دلیل سے آپ ﷺ کی آفاقیت کو ثابت کیا ہے۔انھوں نے لکھا ہے کہ آپ ﷺ کو اہل عرب کا نبی تسلیم کرنا اس بات کو مستلزم ہے کہ آپ ﷺ کو عالم گیر نبی مانا جائے۔آپ ﷺ کی رسالت کے آفاقی ہونے کا انکار اور آپ ﷺ کی نبوت کا اقرار دو متناقض باتیں ہیں۔ابن تیمیہ کے الفاظ ہیں:

فالإقرار برسالته إلى العرب دون غيرهم مع ما ظهر من عموم دعوته للخلق كلهم، قول متناقض ظاهر الفساد وكل ما دل عليه أنه رسول فإنه يستلزم رسالته إلى جميع الخلق وكل من اعترف بأنه رسول لزمه الاعتراف بأنه رسول إلى جميع الخلق. (62)

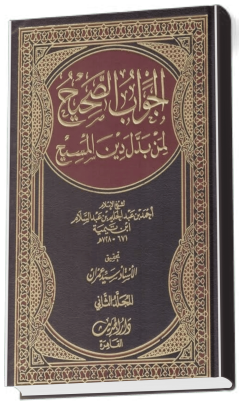

سو آپ ﷺ کی تمام مخلوق کو دعوت کے واضح دلائل کے ہوتے ہوئے، آپ ﷺ کی رسالت کا صرف عربوں کی حد تک اقرار ایک متناقض و باطل قول ہے۔ ہر وہ دلیل جو آپ ﷺ کی رسالت پر دلالت کرتی ہے آپ کے تمام مخلوق کے لیے نبی ہونے پر بھی دال ہے۔ آپ ﷺ کی رسالت کا اقرار کرنے والے ہر شخص کو یہ ماننا پڑے گا کہ آپ ﷺ تمام مخلوق کی طرف نبی بن کر تشریف لائے ہیں۔

قرآن کے ساتھ ساتھ احادیث سے بھی آپ ﷺ کی نبوت کی عالم گیریت کا واضح اثبات ہوتا ہے۔مثلاً فرمایا:

"وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلَى قَوْمِهِ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً.

پہلے نبی صرف اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا، مجھے کائنات کے تمام انسانوں کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا ہے۔(63)

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے پانچ چیزوں کا ذکر فرماتے ہوئے (جو آپ ﷺ کے سوا کسی اور نبی کو نہیں دی گئیں) فرمایا:

"بعثتُ إِلَى الْأَحْمَرِ وَالْأَسْوَدِ.

میں سرخ وسیاہ سب کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔(64)

بہت سے عقلی دلائل بھی اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں:

رسول اکرم ﷺ ایک ایسی رسالت کے ساتھ مبعوث ہوئے جو عام بھی ہے اور تمام بھی۔ یہ انسانی مصلحتوں اور تقاضوں کو مکمل طور پر پورا کرنے والی ہے اور اس میں تمام لوگوں کی دنیا اور آخرت کی نیک بختی پوشیدہ ہے۔اس حقیقت کا ادراک آپ ﷺ کی عطا کردہ شریعت کو بہ نظر انصاف دیکھنے والا ہر شخص آسانی سے کرسکتا ہے۔

زندگی کے تمام گوشوں پر محیط مسائل کے حل کے لیے جس قدر حضور ﷺ کی تعلیمات چودہ سو سال سے زائد عرصے سے رہنمائی کررہی ہیں، وہ بھی آپ ﷺ کی دعوت کے آفاقی ہونے پر ایک بہت بڑی دلیل ہے۔

حضرت محمد ﷺ کے سوا دنیا میں کوئی ذات ایسی نہیں جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں میں ہماری کامل رہ نمائی کر سکے؛ یہاں تک کہ بڑے اور معروف مذاہب کے پیروکار اپنے مذاہب کے بانیوں کو زندگی کے ہر شعبے کے لیے بہترین نمونہ عمل کے طور پر پیش بھی کم ہی کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ، مہاتما بدھ، کرشن جی، رام چندر جی، بابا نانک وغیرہ کے پیروکاروں میں سے کم ہی ہوں گے جو اس بات کے دعوے دار ہوں کہ زندگی کے ہر شعبے کے لیے ہمارے رہ نما کی رہ نمائی کافی ہے۔ اس لیے کہ گویہ لوگ نیک اور بھلے انسان ہیں، ان کی سیرت زندگی کے ہر شعبے اور بالخصوص آج کی ترقی یافتہ دنیا کے بہت سے امور میں رہ نمائی کا سامان اپنے اندر نہیں رکھتیں۔ اس کے برعکس اہل اسلام نہایت وسیع پیمانے پر آپ ﷺ کی زندگی کو کامل نمونہ عمل کے طور پر پیش کرتے ہیں اور نہایت محکم دلائل کی بنیاد پر ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں کہ ہمارا رہ نما زندگی کے ہر شعبے میں انسانیت کا رہ نما ہے اور یہ چیز آپ ﷺ کی رسالت کے آفاقی ہونے کے بغیر ممکن نہیں۔

اہل اسلام کے ہاں آپ ﷺ کا آخری نبی ہونا مسلمہ عقیدہ ہے۔ اہل اسلام نے اپنے اندر ہزار اختلافات گوارا کیے۔ لیکن کسی مدعی نبوت کو اپنی صفوں میں گوارا نہیں کیا۔ یہ ختم نبوت بھی آپ ﷺ کی آفاقیت کی ناقابل انکار دلیل ہے۔ جب اور کوئی نبی نہیں آنا تو لامحالہ قیامت تک کے اور تمام علاقوں اور ممالک کے لوگوں کو آپ ﷺ ہی سے رہ نمائی لینا ہے، اور یہ رہ نمائی جبھی ممکن ہے جب آپ ﷺ عالم گیر نبی ہوں۔ گویا آپ ﷺ کی عالم گیریت کا انکار آپ ﷺ کی ختم نبوت کا انکار ہے اور آپ ﷺ کی ختم نبوت کا انکار آپ ﷺ کی نبوت کا انکار ہے۔ لہذا جو شخص آپ ﷺ کو نبی مانے اسے آپ ﷺ کو عالمی نبی بھی ماننا پڑے گا، ورنہ وہ اپنے دعوائے اقرار رسالت محمدی ﷺ میں معتبر قرار نہیں پا سکے گا۔ یہی وجہ کہ ماہرین شریعت آپ ﷺ کی ختم نبوت کو آپ ﷺ کی رسالت عامہ کی ایک بہت بڑی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ **مقاصد الشریعة الإسلامیة** کے مصنف ابن عاشور اسی دلیل سے شریعت اسلامیہ کو شریعت عامہ ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> **معلوم بالضرورة من الدين أن شريعة الإسلام جاءت شريعة عامة داعية جميع البشر إلى اتباعها؛ لأنها لما كانت خاتمة الشرائع استلزم ذلك عمومها لا محالة سائر أقطار المعمور، وفي سائر أزمنة هذا العالم. والأدلة على ذلك كثيرة من نصوص القرآن والسنة الصحيحة بحيث بلغت مبلغ التواتر المعنوي.**
>
> ضرورت دین سے واضح ہے کہ شریعت اسلامیہ شریعت عامہ ہے، جو تمام بنی نوع انسان کو اپنی اتباع کی دعوت دیتی ہے۔ اس کا آخری شریعت ہونا اس کے عموم اور تمام اہل عالم اور تمام ازمنہ کے لیے ہونے کو مستلزم ہے۔ اس امر پر قرآن اور سنت صحیحہ کے بکثرت دلائل ہیں، جو معنوی تواتر کے درجے کو پہنچے ہوئے ہیں۔ (65)

آپ ﷺ کو چالیس سال کی عمر میں پہلی قرآنی وحی موصول ہوئی تو جو آیات نازل ہوئیں ان میں واضح طور پر خلق، قلم اور علم کے حوالے سے انسان کا لفظ مطابقاً استعمال کیا گیا۔ ارشاد ہوا:

> **اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ . خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ. الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ**

يَعْلَمْ (العلق:1-5)

اپنے رب کے نام سے پڑھیے جس نے پیدا کیا۔ انسان کو جونک کی طرح کے وجود سے بنایا۔ پڑھیے اور آپ کا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم سے علم سکھایا۔ آدمی کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔(66)

علاوہ ازیں قرآن حکیم میں جگہ جگہ مطلقاً بنی نوع انسان سے خطاب کیا گیا ہے۔ یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ ﷺ کی رسالت محض عرب تک محدود نہ تھی، بلکہ اس کا دائرہ تمام بنی نوع انسان کو محیط تھا۔

تعلیمات نبوی اور اس کی دعوت میں ایک تدریج کارفرما رہی ہے۔ اسلامی دعوت اپنے مواد، اسلوب اور ظروف کے اعتبار سے چند زمانی اور مکانی مراحل سے گذری ہے، جس کے دو مرکزی ادوار ہیں:

1 مکی دور (۶۱۰-۶۲۲)

۲ مدنی دور (۶۲۲-۶۳۲)

اس دوران میں آپ ﷺ نے جس عظیم اور عالمی دعوت کو اپنی زندگی میں ہی باحسن وجوہ کامرانی سے ہم کنار کیا اس پیغمبرانہ جدوجہد کی کامیابی میں چند اہم مرکزی اقدامات وواقعات کا کردار کلیدی رہا، پہلا اقدام ایک ہجری میں اسلامی ریاست مدینہ کا قیام، دوسرا ۸ ہجری میں فتح مکہ، تیسرا ۱۰ ہجری میں خطبہ حجۃ الوداع کے ذریعے ایک نئے عالمی نظام کا آوازہ اور چوتھا مشرق سے مغرب تک عالمی سطح پر اسلامی دعوت کی تحریک کو بپا کر دینا تھا۔ دعوت کے مرکزی نکات میں توحید، رسالت، آخرت، کرامت انسانی وغیرہ امور شامل تھے اور یہ ایک آفاقی پیغام ہے جو آپ ﷺ نے تمام انسانیت تک پہنچایا۔ اس پیغام کے ہر جز میں آفاقیت ہے۔ عبادت کو ہی لیجیے، قرآن اور صاحب قرآن نے اپنے مخاطبین کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ اس بات پر ایمان اور اعتقاد رکھیں کہ اس کائنات کی ہر چیز اللہ کی عبادت اور بندگی بجالاتی ہے۔ اکیلا انسان ہی یہ عبادت سرانجام نہیں دیتا۔ ارشاد ہے:

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ ۚ وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ. (الإسراء:44)

ساتوں آسمان زمین اور جو کچھ اُن میں ہے اس کی تسبیح کرتی ہے اور ہر چیز اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں۔(67)

یوں اسلامی عقیدہ انسان اور اس کے ارد گرد مادی کائنات کے مابین ایک مضبوط رشتہ استوار کر دیتا ہے؛ چرند پرند، جمادات، نباتات اور حیوانات سب کے ساتھ محبت کا ایک تعلق پیدا کر دیتا ہے۔ کائنات کی تمام اشیا اسی قادر مطلق کی تقدیر کی پابند اور اس کی اطاعت گزار ہیں۔ اسلام کا انسان اور کائنات کو اس انداز سے لینا بھی اس کی آفاقیت کی دلیل ہے۔

حضور ﷺ کے پیروکاروں کا آپ ﷺ کی دعوت کو دنیا کے دور دراز علاقوں میں پہنچانا اور اس کے لیے ان تھک جدوجہد کرنا بھی اس بات کی گواہی ہے کہ آپ ﷺ کی دعوت تمام بنی نوع انسان کے لیے تھی۔ اس کام کے لیے آپ ﷺ سے انتہائی عقیدت و

محبت رکھنے والے بہت سے اصحاب رسول ﷺ نے خود کو وقف کر لیا تھا۔کوئی انصاف پسند اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ حضور ﷺ نے اپنی دعوت کے مخاطب صرف عربوں کو قرار دیا ہو اور آپ ﷺ کے جاںنثار صحابہ رضوان اللہ علیہم اسے تمام عالم میں پہنچانے کا عزم لے کر نکل کھڑے ہوں۔

آپ ﷺ نے خطبہ حجتہ الوداع میں جو سب انسانوں کے لیے درس مساوات دیا وہ بھی آپ ﷺ کی آفاقیت ثابت کر رہا ہے۔آپ نے فرمایا:

يا أيها النَّاسُ ! إِنَّ رَبَّكم واحد، وإن أباكم واحد، ألا لا فضل لعربي على عجمي ولا لعجمي على عربي ولا لأحمر على أسود ولا لأسود على أحمر الا بالتقوى. (68)

(اے لوگو! بے شک تمھارا رب ایک ہے، تمھارا باپ ایک ہے، خبردار! کسی عربی کو عجمی پر کسی عجمی کو عربی پر کسی سرخ کو سیاہ پر اور کسی سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، سوائے تقویٰ کے۔)

یہ الفاظ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں رہنے دیتے کہ حضور ﷺ کی نگاہ صرف عربوں پر نہیں، تمام بنی نوع انسان پر تھی۔اگر آپ ﷺ کی دعوت صرف اہل عرب کو ہوتی تو آپ ﷺ نہ تمام بنی آدم کو مخاطب بناتے نہ انسانوں کے ایک باپ سے ہونے کا تذکرہ کرتے نہ عربی عجمی اور سرخ سیاہ بول کر پورے عالم کو درس مساوات دیتے۔

رہا آپ ﷺ کے دیگر ممالک کے رہنماؤں کو لکھے گئے خطوط کا معاملہ، تو اگرچہ مستشرقین نے عام طور پر ان کی استنادی حیثیت پر سوال اٹھایا ہے لیکن ان کا معتبر و مستند ہونا مسلمہ ہے۔جدید تحقیقات نے ان خطوط نبوی کے مستند ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ڈاکٹر حمید اللہ نے اس ضمن میں نہایت وقیع تحقیق پیش کی ہے۔انھوں نے متعدد مکتوبات نبوی کو دریافت کر کے ان کے عکس پیش کیے ہیں اور اس حوالے سے مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات دیے ہیں۔(69) انھوں نے ثابت کیا ہے کہ آپ ﷺ کے یہ خطوط نہ صرف حقیقت ہیں بلکہ بہت زیادہ تعداد میں ہیں۔ان کی تحقیق کے مطابق ان خطوط کی تعداد سو دو سو تک ہے۔اگرچہ بہت سے خطوط دست برد زمانہ کا شکار ہو گئے لیکن متعدد خطوط اب بھی اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں۔لہٰذا ان خطوط کو جعلی قرار دینا حقائق کے خلاف ہے۔

ان گزارشات کے بعد ہم آفاقیت محمدی ﷺ کے حوالے سے اہل مغرب کی جانب سے سامنے آنے والے دلائل کی طرف آتے ہیں۔مغرب کے زیر نظر نظریے کے خلاف اہل مغرب کی جانب سے دلائل لانا بظاہر خاصا مشکل ہے، اس لیے کہ یہ نظریہ درحقیقت شدومد سے پیش ہی وہ مغربی اہل علم و تحقیق کر رہے ہیں، جو آپ ﷺ پر لگائے گئے دیگر الزامات و اعتراضات اور اہل مغرب کی آپ ﷺ سے متعلق قدیم مغربی غلطیوں اور تعصبات کے خاتمے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں، لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ اہل مغرب کی طرف سے اس نظریے کی بھی واضح تردید سامنے آ چکی ہے۔سب سے مؤثر، ناقابل دفاع اور زبان حال سے پکار پکار کر مذکورہ تصور کو باطل قرار دینے والی تردید مغرب کے وہ بہت سے یہودی و مسیحی اہل علم ہیں جو دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔ان

کا قبول اسلام اس بات کا اعلان ہے کہ حضور ﷺ آفاقی نبی ہیں اور آپ ﷺ کی دعوت جس طرح اہل عرب کے لیے ہے اہل مغرب اور دیگر اہل عالم کے لیے بھی ہے۔

تھامس واکر آرنلڈ (۱۸۶۴-۱۹۳۰) کی Preaching of Islam میں نبوت محمدی ﷺ کی آفاقیت کے حوالے سے تفصیلی اور مثبت مواد ملتا ہے۔ آرنلڈ نے نہایت مدلل اور پر زور انداز سے اس بات کی تردید کی ہے کی حضور ﷺ کے مخاطب صرف اہل عرب تھے، اور آپ ﷺ نے باقی دنیا کو اپنی دعوت پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ اسلام اپنے کردار کو واضح طور پر عالمی و آفاقی قرار دیتا ہے۔ قرآنی آیات اور آپ ﷺ کی سیرت اس حقیقت کی ناطق شہادتیں ہیں کہ آپ ﷺ نے نہ صرف اپنے پیغام کو آفاقی سمجھا اور قرار دیا بلکہ اس کو جہاں تک ممکن ہوسکا عرب سے باہر لوگوں تک پہنچانے کے لیے ان تھک جدو جہد کی۔ آرنلڈ کے مطابق اسلام کی تبلیغی روح کو اس سے کسی طور جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں یہ روح شروع سے لے کر آج تک بلا انقطاع کارفرما اور روز روشن کی طرح عیاں نظر آتی ہے۔ وہ کہتا ہے:

> اسلام شروع ہی سے ایک تبلیغی مذہب ہے، جو لوگوں کو دائرہ اسلام اور اہل ایمان کو رشتہ اخوت میں داخل کرنے کی غرض سے ان کے دل جیتنا چاہتا ہے، اور تبلیغ و دعوت کی یہ صورت جیسے آغاز میں تھی ویسے ہی آج بھی جاری ہے۔(70)

میور نے پیغام محمدی ﷺ کو اہل عرب کے لیے خاص قرار دیتے ہوئے لکھا تھا:

> پوری دنیا کے اسلام کا ورثہ ہونے کا تخیل بعد کی پیداوار ہے وحی سادہ عربی زبان میں اہل عرب کی تعلیم وتربیت کے لیے آرہی تھی۔ احکام از اول تا آخر کسی اور کے لیے نہیں صرف عربوں کے لیے تھے۔(71)

آرنلڈ نے میور کے اس خیال کو رد کرتے ہوئے واضح کیا کہ:

> تبلیغ اسلام بعد کا تخیل نہیں بلکہ مسلمانوں کو ابتدا ہی سے اسے تمام بنی نوع انسان تک پہنچانے کے احکامات ملتے ہیں۔(72)

آرنلڈ نے متعدد قرآنی آیات کا حوالہ دے کر ثابت کیا ہے اسلام شروع دن ہی سے نظری و عملی ہر دو لحاظ سے ایک مکمل مذہب ہے۔ محمد ﷺ نے تبلیغ و دعوت کی قرآنی تعلیمات پر عمل کی اعلیٰ ترین مثال قائم کی۔ آپ ﷺ غیر مسلموں کو دائرہ اسلام میں لانے والے بے شمار مسلم مبلغین کے سردار ہیں۔(73) اس نے حضور ﷺ کے آفاقی پیغام پر شاہد کئی ایک آیات کا تذکرہ کر کے میور اور لیون کیٹانی (۱۸۶۹-۱۹۳۵) جیسے مغربی اہل قلم پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ ان واضح شواہد کے ہوتے ہوئے انھوں نے کیسے اس حقیقت کا انکار کیا کہ محمد ﷺ اپنے مذہب کو آفاقی سمجھتے تھے۔ اسلام کو آفاقی باور کرانے والی بہت سی آیات کے تناظر میں میور اور کیٹانی کے حوالوں کے ساتھ محمد ﷺ کے اپنے مذہب کو آفاقی نہ سمجھنے کے تصور کی تردید کرتے ہوئے آرنلڈ نے حاشیے میں لکھا:

> یہ امر حیرت ناک ہے کہ ان قرآنی بیانات کے ہوتے ہوئے بعض لوگوں نے اس بات کا انکار کیا ہے کہ اسلام کے بانی اسے ایک آفاقی مذہب سمجھتے تھے۔(74)

پیغام اسلام کے اپنے مزاج کے اعتبار سے عالمی و آفاقی ہونے اور صرف اہل عرب تک محدود نہ ہونے کو واضح کرتے ہوئے

آرنلڈ نے کہا:

اسلام کا پیغام صرف عربوں کے لیے نہیں جملہ اہل عالم کے لیے تھا۔ خدا ایک ہی ہے، لہٰذا مذہب بھی ایک ہی ہونا چاہیے تھا، جس میں آنے کی سب لوگوں کو دعوت دی جاتی۔(75)

ابتدا ہی میں مختلف ممالک کے صحابہ کے آپ ﷺ کی مصاحبت میں آنے، آپ ﷺ کے انھیں ان ملکوں کا پھل قرار دینے اور کسی نوع کی فتوحات سے پہلے آپ ﷺ کے عدم تجدید دعوت کی نسبت سے اسلام کے کردار سے متعلق رویے کو آفاقیت اسلام پر دلیل قرار دیتے ہوئے آرنلڈ لکھتا ہے:

پیغمبر ﷺ کی تمام بنی آدم کو دعوت کے دعوے کا مزید ثبوت محمد ﷺ کا پیغمبرانہ انداز سے بلال کو حبشہ، صہیب کو یونان اور سلمان (جو مدینے کے پہلے عیسائی غلام تھے جنھوں نے ہجرت کے پہلے برس اسلام قبول کیا تھا) کو فارس کا پھل قرار دینے کے الفاظ میں ملتا ہے۔ اس طرح فتوحات کے سلسلے سے بہت پہلے، جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے بالکل واضح کر دیا تھا کہ اسلام صرف نسل عرب تک محدود نہ تھا۔(76)

حضور ﷺ کے مختلف ممالک کے حکمرانوں کو لکھے گئے دعوتی خطوط، نبوت محمدی ﷺ کی آفاقیت کی ایک نہایت روشن دلیل ہیں، اگرچہ بعض مغربی اہل قلم نے ان خطوط کی ثقاہت پر سوالات اٹھائے ہیں، آرنلڈ نے ایسے شکوک وشبہات کی طرف اشارہ کیا (77) لیکن حضور ﷺ کے دعوتی خطوط کو اسلام کی آفاقیت پر دلیل قرار دینے میں جھجک محسوس نہیں کی۔ وہ خطوط نبوی پر مغربی اعتراضات کو ناقابل اعتنا باور کراتے نظر آتے ہیں۔ ان کے مطابق پیغام محمدی ﷺ کی آفاقیت اس درجہ روشن حقیقت ہے کہ ان خطوط کے بغیر بھی نہیں جھٹلائی جا سکتی۔ وہ مختلف خطوط کا حوالہ دینے اور ہرقل کو لکھے گئے خط کا ترجمہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

یہ خطوط ان لوگوں کو، جنھوں نے اس وقت انھیں وصول کیا، کتنے ہی غیر منطقی کیوں نظر نہ آتے ہوں بعد کا زمانہ بتاتا ہے کہ یہ خالی خولی شوق و اشتیاق کے تحت نہ لکھوائے گئے تھے۔ یہ مخطوط صرف اس دعوے کا ایک مزید واضح اور کھلا ثبوت مہیا کرتے ہیں جو قرآن میں اسلام کو آفاقی مذہب کے طور پر پیش کرتے ہوئے تکرار کے ساتھ کیا گیا ہے۔(78)

حضور ﷺ کے دیگر ممالک کے سربراہوں کو لکھے گئے خطوط کا حقیقت ہونا اس قدر واضح ہے کہ آپ ﷺ کے لیے انتہائی سخت اور نامناسب الفاظ استعمال کرنے والے متعصب مستشرق بھی ان کو جھٹلا نہیں سکے۔ گسٹاویل ایسے ہی مستشرقین سے تعلق رکھتا ہے، اس نے بھی آپ ﷺ کے بیرونی سربراہوں اور سرداروں کو لکھے گئے خطوط کو رد کرنے کی بجائے ایک معلوم ومعروف واقعے کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

یہاں تک کہ فتح مکہ سے بھی پہلے آپ ﷺ نے ایران، بازنطین اور حبشہ کے شہزادوں کے پاس قاصد بھیجے تھے۔ آپ ﷺ نے مصر کے عیسائی گورنر اور ایران و بازنطین کے زیر اثر عرب سرداروں کو بھی دعوت اسلام دی۔ ان قاصدوں کو کم وبیش مخالفانہ رد عمل کا سامنا کرنا پڑا۔ صرف یونانی گورنر نے انھیں دوستانہ انداز سے خوش آمدید کہا اور پیغمبر ﷺ کے لیے قابل قدر تحائف

بھیجے، اگرچہ اس نے اسلام قبول نہ کیا۔(79)

یہاں گسٹاویل کے حوالے سے یہ ذکر کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس کی تحریر اس نظریے کی بھی واضح تردید کر رہی ہے کہ اسلام کے آفاقی ہونے اور اسے غیر عربوں میں پھیلانے کا خیال آپ ﷺ کے بعد مسلمانوں میں پیدا ہوا۔ گسٹاویل اگرچہ اس خیال کو مثبت انداز میں پیش نہیں کرتا، تاہم وہ تسلیم کرتا ہے کہ اسلام کے تمام بنی نوع انسان کے لیے ہونے کا خیال بعد کے مسلمانوں کا نہیں، بلکہ خود آپ ﷺ کا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:

> ۶۲۸، اور ۶۲۹ء کے درمیان بدوؤں کے خلاف متعدد اور مہمات روانہ کی گئیں۔ اہل ایمان کی تعداد میں ڈھیرے ڈھیرے اضافہ ہوا اور محمد ﷺ کے ذہن میں یہ تصور پختہ ہوگیا کہ اسلام واحد بچے دین کی حیثیت سے محض ایسا مذہب نہیں جو صرف اہل عرب کے لیے ہو بلکہ یہ پوری انسانیت کے لیے تھا۔(80)

نمایاں نکات بحث

گذشتہ بحث سے یہ نکات نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں کہ پہلے زمانے میں اہل مغرب حضور ﷺ پر وحی کی توجیہ کے لیے کسی اسلامی ماخذ کی طرف رجوع کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔ وہ کسی ایسے شخص کا تخیل قائم کرتے جس نے اپنے ذاتی مفادات کی غرض سے وحی کا ڈھونگ رچایا ہو اور اس تخیل کا مصداق آپ ﷺ کو ٹھہراتے۔ بعد میں جب ایسی الزام تراشیوں کا فضول ولایعنی ہونا مبرہن ہوگیا تو بعض روایات کی مضحکہ خیز تعبیرات پیش کر کے آپ ﷺ پر مرگی کے مریض ہونے کا الزام عائد کر دیا گیا۔ جب مرگی کا الزام بھی اس درجہ لغو ثابت ہوگیا کہ اسے تاریخی تنقید کے خلاف جرم وگناہ کا ارتکاب قرار دیا جانے لگا اور جدید تعلیم یافتہ مغرب میں اس الزام کو دہرانا یا اس پر دلائل لانا ایک فضول وجاہلانہ تصور قرار پایا تو اہل مغرب کے ہاں وحی محمدی ﷺ کی یہ جدید فلسفیانہ تعبیر سامنے آئی کہ ﷺ جن خیالات وتصورات کو وحی کی حیثیت سے پیش کرتے تھے، وہ آپ ﷺ کے اپنے لاشعور سے ابھرے تھے۔ یعنی آپ ﷺ کی وحی کوئی وحی آسمانی نہیں تھی، اپنے زمانے کے دگرگوں حالات کو سنوارنے اور اہل عرب کے جاہلانہ وظالمانہ نظام زندگی کو عادلانہ نظام میں ڈھالنے سے متعلق آپ ﷺ کی تڑپ اور لگن کا نتیجہ تھی لیکن کچھ عرصے بعد اس جدید فلسفیانہ توجیہ کی بھی تردید سامنے آگئی اور اس توجیہ کے لیے مشہور مستشرق منٹگمری واٹ نے خود اعتراف کر لیا کہ آپ ﷺ کی وحی آپ ﷺ کے ذاتی افکار نہیں بلکہ اللہ تعالی کی طرف سے بھیجی ہوئی تعلیم تھی۔ گویا اسلام پر کام کرنے والے نمایاں مغربی اہل علم نے آپ ﷺ کے خدا سے وحی پانے کو تسلیم کر لیا۔ البتہ ان لوگوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ آپ ﷺ کی نبوت صرف اہل عرب کے لیے تھی، باقی دنیا آپ ﷺ کی مخاطب نہیں۔(81) یہود ونصاری کے پاس پہلے ہی وحی الہی موجود ہے، لہٰذا آپ ﷺ نے ان کو دعوت اسلام نہیں دی، لیکن اس موقف کی بھی اہل مغرب کی طرف سے تردید ہو چکی ہے۔ آرنلڈ جیسے نام اور مغربی اہل قلم ناقابل تردید دلائل سے ثابت کر چکے ہیں کہ آپ ﷺ کا پیغام صرف اہل عرب نہیں بلکہ تمام اہل عالم کے لیے تھا۔ کثیر تعداد میں اسلام قبول کر لینے والے مغربی اہل علم بھی نبوت محمدی ﷺ کی آفاقیت کی ناطق شہادتیں ہیں۔

نتیجہ بحث

یہ مطالعہ اس حقیقت کو مبرہن کر رہا ہے کہ مغربی فکر نے وحی و نبوت محمد ﷺ کے حوالے سے ایک ارتقائی سفر طے کیا ہے۔ آج مغرب کے نہایت نمایاں اور سنجیدہ اہل علم آپ ﷺ کی نبوت کا واضح اقرار کر رہے ہیں۔(82) مغربی افکار کا یہ تاریخی جائزہ ہمیں اس نتیجے پر پہنچا رہا ہے کہ اہل مغرب جس طرح آج آپ ﷺ کے بارے میں یہ تسلیم کر رہے ہیں کہ آپ ﷺ اہل عرب کے نبی ہیں، انھیں جلد یا بہ دیر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ آپ آخری و آفاقی نبی ہیں۔ اگرچہ آرنلڈ جیسے اہل مغرب اس بات کو واضح کر چکے ہیں کہ محمد ﷺ نے اپنے مذہب کو محض اہلِ عرب تک محدود نہیں رکھا، لیکن مغرب کے عصر حاضر کے عام اہل علم کے ہاں ابھی تک حضور ﷺ کو اس انداز سے سچا آفاقی و عالمی نبی تسلیم نہیں کیا گیا، جس انداز سے واٹ، کیرن اور ارنسٹ وغیرہ عصر حاضر کے بہت سے معروف اہل علم نے آپ ﷺ کو اہل عرب کا سچا نبی مانا ہے۔ گویا سنجیدہ مغربی اہل علم وقلم کے ہاں رسالت محمدی ﷺ کے اثبات کے حوالے سے صرف ایک مرحلہ طے ہونا باقی ہے۔ اگر یہ مرحلہ "مرحلہ شوق" ہوتا تو شاید بہت جلد طے ہو جاتا، لیکن یہاں یہ معاملہ نہیں۔ یہاں تو معاملہ ان لوگوں سے ہے جو حقیقت کو آنکھوں سے دیکھے بغیر نہیں مانتے۔ کیا معلوم خداوند قدوس ان کو اس حقیقت کا مشاہدہ کرانے ہی والا ہو کہ اس کا وعدہ ہے:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ. (فصلت:53)

ہم انھیں عنقریب اپنی نشانیاں آفاق و انفس میں دکھائیں گے تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ وہ (قرآن) حق ہے۔(83)

اگر ان کی اونٹ اور کبوتر کی کہانیاں انھی کی تحقیقات سے بے مغز افسانے قرار پا سکتی ہیں، مرگی کا الزام تاریخی تنقید کے خلاف جرم و گناہ ٹھہر سکتا ہے، حالات کے فطری ردعمل کا نظریہ باطل ہو سکتا ہے تو نبوت محمدی ﷺ کے صرف اہل عرب تک محدود ہونے کا دعوی اپنی موت کیوں نہیں مر سکتا۔

حوالہ جات

1-اس طرح کے بعض افسانوں اور تخیل کی کارفرمائیوں کے لیے مندرجہ ذیل حوالہ جات ملاحظہ کیجیے:

Thomas Carlyle, On Heroes and Hero Worship (Philadelphia: Henry Altemus, ND), 61; Henry Stubbe, An account of the Rise and Progress of Mahometanism with the life of Mahomet,ed; Hafiz Mahmud Khan Shairani(London: Luzac & co,1911),225-226 ; Stubbe, Ibid,228.cf. Andrew Boorde, The fyrst (first)book of knowledge, ed; F. J. Furnivall(London: N. Trubner & co, MDCCLXX(

2- Thomas Carlyle, Ibid, 61.

3-معروف اطالوی شاعر ہے۔ Danie کا پورا نام Durante Degli Alighieri اور زمانہ ۱۲۲۵-۱۳۲۱ھ ہے۔ اس کی

نظم Divine Comedy مغرب میں ادب کا شاہ کار تصور کی جاتی ہے۔

4۔ صلیبی جنگوں کے زمانے میں مغرب میں مسلمانوں کے لیے استعمال ہونے والا ایک لفظ۔ یہ کئی دیگر الفاظ کی طرح مسلمانوں سے نفرت، بغض اور کینے کی بنا پر انہیں حقیر و ذلیل خیال کرتے ہوئے استعمال ہوتا تھا۔ اس لفظ کے ذریعے مسلمانوں کو بدو صحرا نشیں، چور، ڈاکو، حرامی اور ذلیل و کمتر نسل کے لوگ ظاہر کیا جاتا تھا۔

5- W. Montgomery Watt, Muhammad: Prophet and Statesman (London: Oxford University Press, 1961), 231.

6- W. Montgomery Watt, Muhammad at Medina (Oxford: Clarendon press, 1956), 332.

7 -Watt, Muhammad: Prophet and Statesman, 232.

8- W. Montgomery Watt, Muhammad at Mecca (Oxford: Oxford University Press, 1953), 52.

9-Karen Armstrong, Muhammad: A Biography of the Prophet (London: Orion publishing, 2004),26.

10– RomLandau, Islam and the Arabs (London: George Allen&Unwin, 1958), 23; Tor Andrae, Muhammad: The man and his faith, Trans: Theophil Menzel (London: George Allen & Unwin, 1956), 72-72 ; Gustav Weil, History of Islamic Peoples, Trans: Khuda Bakhsh (Calcutta: University of Calcutta press, 1914), 27.

11- عز الدين فراج، نبي الإسلام في مرآة الفكر الغربي (قاهره: دار الجهاد، ١٩٥٣ء)، ٣٥؛ عبد الله مبشر الطرازی، نبي الإسلام في مرآة بعض المستشرقين المنصفين (جدة: الإسلام والمستشرقون، ١٩٨٥ء): ٣٠٨

12- Alphonse de Lamartine, Histoire de la Turquie (Paris:1854), II/ 276-77.

13- Sir William Muir, Mahomet and Islam: A sketch of the Prophets life from original sources and a brief outline of his religion (London: The religious Tract Society, 1887), 19.

14- Carlyle, On Heroes and Hero Worship, 61-62.

15- Carlyle, Ibid, 62.

16- Mahmut Aydin, Modern Western Christian Theological Understanding of Muslims since

قرآن اور صاحب قرآن

The second Vatican council (Washington DC: The Council for Research in values and Philosophy, 2002),172.cf. Emilio G Aguilar,"The Second International Muslim-Christian Congress of Cordoba (March 21–27, 1977)." Ed. Richard W Rousseau, Christianity and Islam: The Struggling Dialogue (Scranton: Ridge Row Press, 1985),165.

17- Muhammad Khalifa, The Sublime Quran and Orientalism (London& New York: Longman, 1983), 12.

18- Weil, History of Islamic peoples , Trans: Khuda Bakhsh (Calcutta: The Univeristy of Calcutta), 5.

19- Muir, Ibid, 33-35.

20-Muir, Ibid, 35.

21-ابن هشام، السيرة النبوية ت: عمر عبدالسلام تدمری (بیروت: دار الكتاب العربي، ١٤١٠ھ/١٩٩٠ء)، ١: ١٩٠

22-سرسید احمد خاں، سیرت محمدی (لاہور: مقبول اکیڈمی (١٩٩٧)، ٢٣٠-٢٣٢

23- Edward Gibbon, The decline and fall of the Roman Empire (London: Dant & Sons,1962)5: 270.

24- Gibbon, Ibid, 5: 270.

25- Alfred Guillume, Islam (London: Cassell, 1963), 25.

26- Guillume, Ibid, 25-26.

27- RomLandau, Ibid, 23.

28- Watt, Ibid, 19.

29-دیکھیے: محمد احسان الحق سلیمانی، رسول مبین (لاہور: مقبول اکیڈمی، ١٩٩٣)، ٦٢٦-٦٢٧

30- Guillume, Ibid, 26.

31- Watt, Muhammad: Prophet and Statesman, 14.

32- W. Montgomery Watt, Islamic Revelation in the Modern World (Great Britain: Edinburgh University Press, 1969), 109.

33- Watt, Islamic Revelation, 110.

34- Watt, Muhammad: Prophet and Statesman, 17.

35- Muir, Mahomet and Islam, 58.

36- H. A. R. Gibb, Mohammedanism:An Historical Survey (New York: Oxford University press, 1964.25-26.

37-محمد شہباز منج، درمکاتیب الشریعہ،گوجرانوالہ،۲۵:۸(۲۰۱۳)۳۸۔

Cf. William Montgomery Watt, Companion to the Quran(England: Oneword publication, 1994.3.

38- William Montgomery Watt, Islam and Christianity Today: A Contribution to Dialogue (London: Routledge & Kegan Paul, 1983),60-61.

39- Philip K. Hitti, History of the Arabs (London: Macmillan, 1946), 113.

40- R. C. Zaehner, At Sunday Times: An Essay in the Comparison of Religions (London: Faber &Faber, 1958), 27.

41-برطانیہ سے تعلق رکھنے والی سوشلسٹ اورتھیوفسٹ مصنفہ۔انڈیا اور آئرلینڈ کی آزادی کی موید تھی۔خواتین کے حقوق پر کام میں شہرت حاصل کی۔مدراس میں وفات پائی،مرنے کے بعد اس کی نعش کو ہندو رسم کے مطابق جلایا گیا تھا۔

42– Annie Besant, The Life and Teachings of Muhammad(Madras:Adyar, 1932), 4.

43-Daniel, Islam and the West: The Making of an Image, 336.

44-See: HansKüng, Christianity and World Religions: Paths of Dialogue with Islam, Hinduism and Buddhism (New York, Maryknoln, Orbis Books, 1993), 27.

45-Hans Küng, "Towards an Ecumenical Theology of Religions: Some Theses for Clarification.", Hans Küng & J. Moltmann, eds., Christianity among World Religions (Edinburgh: T&T Clark Ltd, 1986), 124.

46-Küng, Christianity among World Religions, 26.

47-Conference of European Churches, Witness to God in Secular Europe (Geneva Conference of European Churches, 1984), 56.

48-Watt, Companion to the Quran,4.

49-William Montgomery Watt, Religious Truth for Our Time (Oxford: Oneworld,

1995), 80.

50-Carl W Ernst, Following Muhammad: Rethinking Islam in the contemporary world (Chapel Hill & London: The University of North Carolina Press, 2003), 90.

51-Armstrong, Muhammad: A Biography of the Prophet, 211-12.

52-القرآن ۳:۶۴

53-القرآن ۴:۴۷، مزید دیکھیے: القرآن ۳:۲۰، القرآن ۳:۱۱۰ القرآن ۳:۱۹۹، القرآن ۵:۱۹، القرآن ۲۸:۵۰ وغیرہ

54-محمد حمید اللہ، رسول اکرم کی سیاسی زندگی کراچی: دار الاشاعت، سان)، ۲۲۳۔

55-القرآن ۲:۷۵-۷۷

56-القرآن ۳:۹۸

57-القرآن ۲۱:۱۰۷

58-القرآن ۳۴:۲۸

59-القرآن ۷:۱۵۸

60-القرآن ۲۶:۹-۱۹۱

61-Mathew, part of the Holy bible: A New translation from the Greek by David Robert Palmer, February 2011 Edition, Chapter15, Verse24, 26.

62- احمد بن تیمیہ، الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح، تحقیق، علی بن حسن و دیگر (السعودیة : دار العاصمة، ۱۹۹۱ ۱:۴۴۸

63- ابو عبد اللہ محمد بن اسمعیل، الجعفی البخاری، صحیح البخاري، تحقیق، محمد زبیر بن ناصر الناصر (دار طوق النجاۃ، ۱۴۲۲ھ)، ۱، ۱۷۴، رقم: ۳۳۵

64-عبد اللہ بن عبد الرحمن الدارمی، سنن الدارمي (بیروت: دار الکتب العلمیة، ۱۴۰۷ھ)، ۲:۲۹۵

65-محمد الطاہر ابن عاشور، مقاصد الشریعة الإسلامية (تونس: دار السلام، دار سحنون، ۱۴۳۰ھ) ۱۰۰۰-

66-القرآن ۹۶:۵-۲

67-القرآن ۱۷:۴۴

68- ابو بکر بن الحسین بن علی البیھقي، شعب الإیمان، ت، عبد العلی عبد الحمید حامد (الریاض: مکتبة الرشد،

۲۰۰۳)۷:۱۳۲، رقم:۴۷۷۴

69- دیکھیے: محمد حمیداللہ، رسول اکرم کی سیاسی زندگی، ۱۰۶-۱۶۴۔

70-T. W. Arnold, The preaching of Islam: A history of the propagation of the Muslim faith (London: Constable, 1913), 44.

71-Sir William Muir, The Caliphate: Its rise, decline, and fall (Religious tract society, St. Paul's churchyard, 1892) ,43.

72- Arnold, The preaching of Islam,3.

73- Arnold, Ibid., 3-5. ,74- Arnold, Ibid., 29.,75- Arnold, Ibid., 28.

76- Arnold, Ibid., 29-30.

77- Arnold, The preaching of Islam, 28.cf.LeoneCaetani, (Milan, Ulrico Hoepli, 1905 1907), 1/725 sqq.

78- Arnold, op.cit., 28.

79- Weil, op.cit., 17.

80- Weil, op.cit., 17.

81- یہ موقف جدید مغربی اہل علم کی ایجاد نہیں بلکہ ان سے پہلے بھی کئی مغربی قلم کار پیش کر چکے تھے۔ اسے ان کی طرف اس لیے منسوب کیا گیا ہے کہ یہ موجودہ دور میں اسے نہایت شد و مد سے سامنے لائے ہیں، نیز وہ آپ ﷺ کو اللہ کا سچا نبی مانتے ہیں۔ پہلے کے اہل قلم عموما آپ ﷺ کو نبی تسلیم کیے بغیر یہ دعوی کرتے تھے کہ آپ ﷺ نے اپنا پیغام اہل عرب تک محدود رکھا تھا۔

82- یہاں یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ اہل مغرب جب حضور ﷺ کو پیغمبر (Prophet) کہتے ہیں تو وہ نبوت و پیغمبری کے مسلم تصور اور عقیدے کے مطابق ایسا نہیں کہہ رہے ہوتے (اور ایسا مختلف عوامل کی بنا پر ہے، جن میں اپنی سوسائٹی اور دینی حلقوں کا دباؤ اور اہل بائبل کے ہاں موجود تصور نبوت و رسالت ہے، جس پر ان شاء اللہ الگ سے کسی تحریر میں بحث ہوگی) تاہم اس حقیقت میں کلام نہیں کہ جب وہ آپ ﷺ کو سچا نبی مانتے ہیں تو اس دعوے کی بنیاد منہدم ہو جاتی ہے کہ محمد ﷺ نے (معاذ اللہ) کسی دنیوی مقصد کے تحت نبوت کا اعلان کیا اور حالات کی سازگاری نے آپ ﷺ کے پیغام کی قبولیت اور اشاعت کی راہ ہموار کی، جیسا کہ اہل مغرب کا ایک زمانے تک دعوی رہا، اور بہت سے اہل مغرب جسے اپنی نادانی یا تعصب کی بنا پر آج بھی حرز جاں بنائے ہوئے ہیں۔

83- القرآن ۴۱:۵۳

...

سنت اور صاحب سنت

حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوریؒ کی خدمات حدیث

مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

تیرہویں چودھویں صدی ہجری میں خدمت حدیث کا عنوان اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک اس کے ساتھ کم سے کم برصغیر ہند میں بارہویں صدی ہجری کی خدمت حدیث کی تاریخ شامل نہ کی جائے، کیوں کہ اس سرزمین پر بعد کی صدیوں میں حدیث شریف کی جو بھی خدمات انجام پائیں اور جس پہلو سے بھی حدیث شریف پر توجہ کی گئی اس کی تمام کڑیاں اور تمام واسطے بارہویں صدی ہجری کے نادرۂ روزگار علماء اور محدثین کرام سے جڑے ہوئے ہیں۔ برصغیر کے بارہویں صدی کے محدثین کرام کو نظر انداز کر کے ہم نہ

> کہنا چاہیے کہ بعد کے دور میں برصغیر ہند میں خدمت حدیث کے جس پہلو پر بھی کام ہوا اور جس زاویے سے بھی حدیث شریف کی خدمت کی گئی، اس میں حضرت شاہ ولی اللہ کا فیضان اور ان کی ذات سے جاری سرچشمۂ علم وایقان کا ایک بڑا حصہ ضرور شامل ہے۔ بعد کے دور میں علمائے برصغیر ہند کی جن خدمات حدیث اور علوم اسلامیہ کا تذکرہ اور ان پر فخر کیا جاتا ہے، وہ تمام حضرت شاہ صاحب اور ان کے خانوادۂ گرامی کی خدمات کا پرتو اور ان کی تربیت وتعلیم اور ہدایات وفیض آبی کا اثر ہے۔ علمائے دیوبند وسہارن پور ہوں، یا علمائے ندوہ، حضرات اہل حدیث ہوں یا دوسرے مکاتب فکر سے وابستہ اصحاب، ہر ایک نے اسی چشمۂ صافی سے سیرابی پائی ہے اور ہر ایک اسی دریا کا ممنونِ کرم اور پروردہ ہے۔

بعد کی تاریخ سے انصاف کر سکتے ہیں، نہ اس سے پہلے کی تاریخ سے۔

بارہویں صدی ہجری میں برصغیر ہند کے دینی علمی افق پر خصوصاً خدمت حدیث کی کہکشاؤں میں ایسے کئی نجوم وماہتاب نمودار ہوئے جن کی روشنی عرب وعجم میں جگہ جگہ پہنچی اور ان سے نہ صرف اس دور میں دنیا بھر کے خادمانِ حدیث نے استفادہ کر کے اپنا دامن مراد پُر کیا، بلکہ ان کے علوم وتصانیف کی ضوفشانی سے حدیث کی دنیا میں چراغاں سا ہوگیا۔ بعد کے دور کا ہر شخص ان کا دامن گرفتہ ہے، ہر اک خادم حدیث ان کی تحریرات وعلمی آثار سے استفادہ واستناد کرسکتا ہے، اور بعد کی ہر ایک علمی خدمت میں ان کی فکر ونظر کے ستارے جھلملاتے نظر آتے ہیں۔

اگرچہ بارہویں صدی ہجری میں برصغیر ہند میں خادمانِ حدیث اور اس مبارک موضوع کی تدریس وتعلیم اور شرح وتحقیق میں مشغول رہنے والے اصحاب کی فہرست خاصی طویل ہے، تاہم ان میں سے جن حضرات کو عالمی شہرت اور اعتماد نصیب ہوا، ان میں

سب سے زیادہ تعداد علمائے سندھ کی ہے، مثلاً صحاح ستہ اور مسند امام احمد بن حنبل کے محشی و شارح، محدث کبیر علامہ شیخ ابوالحسن سندھی کبیر (وفات ۱۱۳۸ھ/ ۱۷۲۶ء)، شیخ ابوالحسن سندھ کے جلیل القدر شاگرد اور قائم مقام، علامہ شیخ محمد حیات سندھی (وفات ۱۱۶۳ھ/فروری ۱۷۵۰ء)، فقیہ زماں علامہ مخدوم ہاشم سندھی (وفات ۱۱۷۴ھ/ ۶۱-۱۷۶۰ء)، شیخ ابوالحسن صغیر (وفات ۱۱۸۷ھ/ دسمبر ۱۷۷۳ء)۔

اسی فہرست میں مولانا شیخ محمد امین ٹھٹوی سندھی (وفات تقریباً ۱۱۸۷ھ/ ۱۷۷۳ء) کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے، بعد کے حضرات میں علامہ جلیل محدث کبیر شیخ محمد عابد سندھی (وفات ۱۲۵۷ھ/جون ۱۸۴۱ء) بھی اسی سنہری زنجیر کی ایک اہم کڑی ہیں۔

اسی زمانے میں جب سندھ کے علماء عالم اسلام کے علمی افق پر جگمگا رہے تھے، شمالی ہند کی ایک چھوٹی سی بستی سے وہ مرد جلیل نمودار و جلوہ فگن ہوا، جس کے وجود، دینی علمی خدمات، آفاقی ملّی تصورات اور فکر و خیال کے خیاباں سے عالم اسلام میں گویا ایک انقلاب آ گیا تھا، جو علم و معرفت کی گہرائی، ظاہر و باطن کی جامعیت، بلند نگاہی و بلند نظری، فکر و تخیل کی جولانی تحریر و قلم کی رعنائی اور علوم اسلامیہ شرعیہ، قرآن مجید، تفسیر و حدیث، فقہ و اصول، کلامیات و معقول، تصوف و سلوک، شعر و ادب، نظم و نثر ہر ایک فن میں، ہر ایک کمال میں گویا فرد فرید اور اپنے معاصرین و اہل نظر سے بہت آگے، بلکہ فخر اقران و امثال تھا۔

یہ حضرت شاہ ولی اللہ (احمد بن عبدالرحیم بن وجیہ الدین) پھلتی ثم دہلوی کی ذات گرامی تھی، جو (۴/شوال سنہ ۱۱۱۴ھ/ اگست ۱۷۰۳ء) میں تولد ہوئے اور (محرم ۱۱۷۶ھ) میں واصل بحق ہو گئے۔ کہنا چاہیے کہ بعد کے دور میں برصغیر ہند میں خدمت حدیث کے جس پہلو پر بھی کام ہوا اور جس زاویے سے بھی حدیث شریف کی خدمت کی گئی، اس میں حضرت شاہ ولی اللہ کا فیضان اور ان کی ذات سے جاری سرچشمۂ علم و ایقان کا ایک بڑا حصہ ضرور شامل ہے۔ بعد کے دور میں علمائے برصغیر ہند کی جن خدمات حدیث اور علوم اسلامیہ کا تذکرہ اور ان پر فخر کیا جاتا ہے، وہ تمام حضرت شاہ صاحب اور ان کے خانوادۂ گرامی کی خدمات کا پرتو اور ان کی تربیت و تعلیم اور ہدایات و فیض آبی کا اثر ہے۔ علمائے دیوبند و سہارن پور ہوں، یا علمائے ندوہ، حضرات اہل حدیث ہوں یا دوسرے مکاتب فکر سے وابستہ اصحاب، ہر ایک نے اسی چشمۂ صافی سے سیرابی پائی ہے اور ہر ایک اسی دریا کا ممنونِ کرم اور پروردہ ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے گرامی مرتبت اخلاف کرام نے حدیث شریف کی ہمہ جہت خدمات کو اپنا مقصد حیات بنا لیا تھا اور اسی نہج پر اپنے شاگردوں اور وابستگان کی تربیت کی۔ علوم اسلامیہ کی ترقی و تازگی اور ان کو زیادہ سے زیادہ مفید و ثمر بار بنانے اور عام کرنے میں حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے فرزندان عالی مرتبت کی خدمات کسی ایک پہلو کے لیے مختص اور ایک دائرے میں محدود نہیں تھیں، بلکہ جب جہاں اور جس طرح کی خدمت کی ضرورت ہوئی اور جس پہلو سے بھی ان کا عرفان و فیضان عام کرنے کی کوشش ہو سکتی تھی، اس کی بلا تاخیر کوشش و تدبیر فرمائی۔ منجملہ اور علوم دینیہ کے، خدمت حدیث کے لیے بھی یہی معمول تھا۔ حدیث شریف کے درس و تعلیم، شرح و تحقیق، تصحیح و تعلیق، تقریر و تحریر اور نقل و مقابلہ ہر ایک مقصد کے لیے یہ سب حضرات خود بھی توجہ فرماتے، اس میں مشغول رہتے اور اپنے شاگردوں کو بھی اس کے لیے تیار فرماتے تھے، جس کے نتیجے میں ایسے ایسے دیدہ ور

بالغ النظر علماء اور محدثین ان کے حلقۂ درس سے نکلے کہ ان کے دم سے علمی محفلوں میں تازگی اور بہار آگئی اور ان کے دم قدم سے خدمت علم خصوصاً خدمت قرآن مجید اور حدیث کے گلستاں لہلہا اٹھے۔ ان ہی علماء اور اخیار میں سے جو حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندان سے فیض یافتہ اور جرعہ نوش ہیں، ایک بڑا اور نہایت گرامی قدر و مرتبت نام حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوری کا ہے۔

حضرت مولانا احمد علی سہارن پور کے انصاری خاندان کے فرزند تھے، ان کا سلسلۂ نسب حضرت سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔ حضرت مولانا کے جد امجد شیخ عبد القدوس گنگوہی کے خلیفہ تھے، ابتدائی سلسلۂ نسب اس طرح ہے: مولانا احمد علی بن لطف اللہ بن محمد جمیل بن محمد خلیل۔ حضرت مولانا کی ولادت (سنہ ۱۲۲۵ھ۔ ۱۸۱۰ء) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم سہارن پور کے مقامی علماء اساتذہ سے حاصل کی، متوسطات سے تقریباً صحیح بخاری تک تمام درسیات، حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، حضرت مولانا سعادت علی فقیہ سہارنپوری اور حضرت مولانا وجیہ الدین صدیقی حسنی سہارن پوری سے اخذ کیں۔

حضرت مولانا کی بخاری شریف کی پہلی سند اس طرح ہے: مولانا وجیہ الدین سہارنپوری از مولانا عبدالحی بڑھانوی، از حضرت شاہ عبدالعزیز۔

تکمیل علوم کے بعد کئی سال تک فرخ آباد میں رہے، وہاں بھی ایک عالم سے پڑھا، مگر ر اس کی تفصیل دریافت نہیں۔ آخر میں جب مولانا کی عمر تقریباً تینتیس سال کی تھی، خاندان ولی اللّٰہی سے براہ راست استفادہ کا شوق ہوا، (سنہ ۱۲۵۸ھ/ ۱۸۴۲ء) کے غالباً اواخر میں حضرت شاہ محمد اسحاق کی خدمت میں حاضر ہوئے، مگر اس وقت حضرت شاہ صاحب ہندستان سے ہجرت کا ارادہ فرما چکے تھے، دہلی سے سفر کا وقت قریب ہونے کی وجہ سے حضرت مولانا سے معذرت فرمائی، مولانا نے عرض کیا کہ اگر میں مکہ معظمہ حاضر ہو جاؤں؟ فرمایا کہ اگر تم آؤ گے تو میں ضرور پڑھاؤں گا، مولانا پر حضرت شاہ صاحب سے استفادہ کا شوق ایسا غالب تھا کہ حضرت شاہ محمد اسحاق کی دہلی سے ہجرت کے چند مہینہ بعد ہی (رجب ۱۲۵۹ھ/ اگست ۱۸۴۳ء) میں مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ مکہ معظمہ میں حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں رہ کر صحاح ستہ اور تفسیر وفقہ کی اعلیٰ ترین کتابیں تحقیق و اطمینان سے پڑھیں۔ حضرت شاہ صاحب نے حضرت مولانا کو جو سند عطا فرمائی اس میں بائیس کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ یہ کتابیں مولانا نے حضرت شاہ صاحب سے تحقیق سے پڑھیں، جس میں تفسیر کی چھ کتابیں تفسیر بیضاوی، تفسیر بغوی، تفسیر جامع البیان، تفسیر جلالین، تفسیر رحمانی وغیرہ شامل تھیں۔ حدیث شریف میں سنن ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، شمائل ترمذی، مسند امام ابوحنیفہ، صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، مسند دارمی، جامع صغیر، مشکوۃ المصابیح اور حصن حصین وغیرہ کی قرأت وسماعت میں شریک رہے۔

آخر میں حضرت شاہ صاحب نے ان سب کی مفصل تحریری اجازت سے نوازا، تقریباً دو سال تک شاہ صاحب کی تعلیم وتلمذ کے بعد غالباً سنہ (۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۶ء) میں ہندستان واپس پہنچے۔

حضرت شاہ صاحب نے حضرت مولانا کو رخصت کرتے وقت خدمت حدیث میں مشغول رہنے کی ہدایت اور وصیت فرمائی تھی۔ حضرت مولانا نے بخاری شریف کے اختتامیہ میں حضرت شاہ اسحاق کی اس وصیت کا تذکرہ کیا ہے، حضرت مولانا نے جن کو مبدأ فیاض نے اس خدمت کے لیے چن لیا تھا، اس پر دل کی گہرائیوں سے لبیک کہا اور ہندستان واپس آتے ہی اس وصیت کی پاسداری اور بجا آوری میں مشغول ہو گئے۔

حضرت مولانا احمد علی نے حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندانی معمول کے مطابق خدمت حدیث کے تمام پہلوؤں پر بیک وقت توجہ فرمائی۔ درس وافادہ، تصحیح ومقابلہ اور تحریر وتعلیق ہر ایک کو سامنے رکھا اور ہر ایک کی پوری پوری خدمت کرنے، بلکہ اس کا حق ادا کرنے کی ایسی کوشش فرمائی کہ جس کی نظیر نہیں۔ درس حدیث کی مسند بچھائی اور تمام عمر اس کی آراستگی اور ترقی کے لیے کوششیں فرماتے رہے۔ دہلی میں اس وقت سے سنہ ۱۸۵۷ء تک حضرت مولانا کا مطبع احمدی خصوصاً حدیث کی اعلیٰ ترین کتابوں کی طباعت و اشاعت کا کام کرتا رہا۔ تحقیق وطباعت کی بے پناہ مصروفیات کے ساتھ بھی درس وافادہ کا سلسلہ بلاناغہ جاری رکھا جس میں طلبہ کا ہجوم رہتا تھا۔

حضرت مولانا نے بخاری شریف کے اختتامیہ میں طلبہ کی کثرت اور درس کی مشغولیت کا ذکر کیا ہے، جب سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں مطبع تباہ ہوگیا تو دہلی سے سہارن پور واپس آگئے، تین چار سال تک سہارن پور میں درس حدیث جاری رہا، اس کے بعد کلکتہ چلے گئے تھے۔ سنہ (۱۲۹۱ھ / ۱۸۴۷ء) میں حضرت حاجی امداد اللہ کی فرمائش کے احترام میں کلکتہ کی ملازمت (جس سے مولانا کو علامہ شبلی نعمانی کے الفاظ میں پانچ سو روپے مہینہ کی آمدنی تھی) ترک کر کے سہارن پور آگئے تھے، یہاں

مظاہر علوم میں اور اپنے گھر پر درس حدیث جاری فرمایا، درس حدیث کا یہ معمول پوری شد ومد سے زندگی کے آخر دنوں تک اسی شان سے جاری رہا، اسی میں وفات پائی۔

اس حلقۂ درس سے جو تقریباً بتیس سال برابر جاری رہا، سینکڑوں اصحاب فیضیاب ہوئے، ان میں سے متعدد وہ ہیں جو ہماری علمی تاریخ کا غازہ اور متاخر دور کے لیے سرمایہ صد مباہات وافتخار ہیں۔ حضرت مولانا کے شاگردوں میں سے چند اہم نام ملاحظہ ہوں:

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا یعقوب گنگوہی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا عبدالجبار عمرپوری، مولانا سلامت اللہ جے راج پوری، مولانا عبدالعلی میرٹھی، مولانا عبداللہ انصاری انبیٹھوی، مولانا مفتی عبداللہ ٹونکی، مولانا تجمل حسین دسنوی، مولانا فدا حسین دربھنگوی، مولانا برکت اللہ سورتی، مولانا محمد بن غلام رسول سورتی، مولانا نور احمد امرتسری، مولانا وصی احمد سورتی، مولانا قمر الدین چکڑالوی وغیرہ رحمہم اللہ۔

حضرت مولانا قدیم علماء کے مطابق متنوع کمالات کا مرقع تھے، بڑے مدرس تھے، مصنف تھے، محقق تھے، مصحح وحاشیہ نگار تھے،

اس کے علاوہ بڑے فقیہ،معروف ومعتمد مشہور مفتی اور مصلح تھے نیز تحریک حضرت سید احمد کے طرز پر اتباع سنت اور رسوم و بدعات کی تردید میں عملی طور پر مصروف ومشغول تھے۔حضرت مولانا کے فتاویٰ اس دور میں نہایت وقعت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے،خصوصاً دہلی اور نواح میں ان کی بڑی منزلت تھی۔حضرت مولانا نے نکاح بیوگان کے احیاء اور رسوم و بدعات کی تردید کے لیے ہر پہلو سے متواتر جدوجہد کی،اس کے لیے وعظ وتقریر کرتے،فتاویٰ لکھتے،تقریریں کرتے،مولانا کے متعدد فتاوی قدیم مطبوعات میں دیکھے جاسکتے ہیں۔اسی طرح نکاح بیوگان کی ترغیب میں کی گئی کئی تقریریں اس موضوع کے مجموعوں میں محفوظ ہیں۔

مولانا کا اس علاقہ میں جو مقام اور عظمت واحترام تھا،اس کا اسی ایک واقعہ بلکہ اعزاز سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ جب دارالعلوم دیوبند کی سب سے پہلی عمارت،نو درہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا،تو اس وقت اکابر دیوبند نے جو تقریباً سب ہی حضرت مولانا کے شاگرد تھے،اس کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے حضرت مولانا سے درخواست کی تھی،حضرت مولانا دیوبند گئے اور نو درہ کا سنگ بنیاد، پہلی اینٹ اپنے دست مبارک سے رکھی تھی، پتہ نہیں اس خدمت کے لیے دیوبند کے قطعاً غیر معروف شخص میاں جی منے کا نام کیوں مشہور کردیا گیا حالاں کہ اس کا دارالعلوم کی قدیم تحریر یا روداد میں تذکرہ نہیں ہے مگر دارالعلوم کی روداد میں پہلی اینٹ رکھنے کے لیے حضرت مولانا احمد علی کے نام کی صراحت ہے۔

حضرت مولانا کی،حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی وفات کے چند دنوں کے بعد،۶ر جمادی الاولی ۱۲۹۷ھ/ ۱۷راپریل ۱۸۸۰ء شنبہ کو سہارن پور میں وفات ہوئی۔مولانا فیض الحسن سہارن پوری،سرسید احمد،عبدالغفور نساخ وغیرہ متعدد اہل علم وذوق نے تعزیتی مضامین لکھے اور قطعات تاریخ کہے۔

حدیث شریف کی اہم ترین کتابوں کی تصحیح، حاشیہ اور اشاعت کی خدمت

حضرت مولانا کی زندگی کا امتیازی وصف اور اہم ترین کارنامہ اور جس پر برصغیر کی علمی تاریخ ہمیشہ فخر وناز کرتی رہے گی اور جس میں حضرت مولانا نہ صرف برصغیر بلکہ بعض پہلوؤں سے پورے عالم اسلام میں ممتاز ومنفرد ہیں۔حدیث شریف کی امہات کتب کی نہایت اہتمام سے اعلیٰ درجہ کی تصحیح،تحقیق وتعلیق اور حاشیہ نویسی کے بعد اعلیٰ درجہ کی اشاعت ہے،جو تقریباً ان سب کتابوں کی پوری دنیا میں پہلی اشاعت بھی تھی۔

حضرت مولانا احمد علی کی طباعت کتب حدیث کی یہ خدمت دراصل خانوادہ حضرت شاہ ولی اللہ کی اشاعت کتب حدیث کے منصوبہ کی توسیع وتکمیل تھی،جب تیرہویں صدی ہجری کے آغاز پر اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں ہندوستان میں پہلی بار پریس آیا اور کتابوں کی نقل کے قدیم طریقہ کی جگہ طباعت کی ابتداء ہوئی اور اس کے ذریعہ سے ایک ایک کتاب کے حسب ضرورت سینکڑوں ہزاروں نسخے ایک معیار وکیفیت کے سامنے آنے ممکن ہو گئے،اس وقت حضرت عبدالعزیز حیات تھے،سب سے پہلے

حضرت شاہ صاحب نے اس نئے طریقہ سے استفادہ کا ارادہ کیا اور حضرت شاہ ولی اللہ کی جلیل القدر تصانیف ’’الفوز الکبیر فی اصول التفسیر‘‘ اور ’’حجۃ اللہ البالغہ‘‘ کی طباعت کا سروسامان کیا، الفوز الکبیر تو چھپ گئی لیکن حجۃ اللہ کی اس طباعت کا کوئی نسخہ اب تک دستیاب نہیں ہوا۔ اسی اصول کے تحت حضرت عبد العزیز کی تفسیر عزیزی، حضرت عبد القادر کا موضح قرآن وغیرہ کئی اہم کتابیں کلکتہ کے مطابع سے شائع ہوئیں اور ملک بھر میں پھیل گئیں۔

یہ سعادت بھی خانوادۂ ولی اللٰہی کے لیے مقدر تھی کہ حدیث شریف کی بنیادی کتابوں کی اشاعت کی ابتداء بھی اسی گھرانے سے ہو۔ حضرت عبدالعزیز کی وفات (۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) کے بعد پریس دہلی پہنچا، دہلی میں سب سے پہلا مطبع قلعہ معلیٰ میں بادشاہ وقت کے اہتمام و انصرام سے قائم ہوا، اس وقت حضرت عبدالعزیز کے جانشین اور خانوادہ ولی اللٰہی کی نسبتوں اور کمالات کے جامع، حضرت شاہ محمد اسحاق نے حدیث شریف کے بنیادی متون کی اشاعت کا ارادہ اور اہتمام فرمایا۔ حضرت شاہ محمد اسحاق نے سنن نسائی

دہلی میں حضرت مولانا کے استاذ مولانا وجیہ الدین سہارن پوری کا ایک مطبع تھا، جو مطبع احمدی کے نام سے کام کر رہا تھا، حضرت مولانا نے اس کو خرید لیا اور اس سے اپنی کتابوں کی طباعت کا سلسلہ شروع کیا اور اس مطبع کو اس قدر ترقی دی کہ کام کی وسعت اور بڑی کتابوں کی طباعت کے انصرام میں شمالی ہند کا کوئی اور مطبع اس کے ہم پایہ نہیں تھا۔

سے اپنی خدمت کا آغاز کیا اور دہلی بلکہ برصغیر اور عالم اسلام میں بھی حدیث شریف کی ایک اہم کتاب سنن نسائی کا ایک عمدہ نسخہ، جو اس دور کی اعلیٰ اور حسین ترین طباعت کا نمونہ تھا، غالباً حضرت شاہ محمد اسحاق کے تصحیح اور حواشی سے مزین ہو کر، حضرت شاہ ولی اللہ اور العزیز کے مختصر افادات کے ساتھ چھپا، جس کی سند کا آغاز:

’’یقول العبد الضعیف، خادم علماء الآفاق محمد اسحاق‘‘ کے الفاظ سے ہوتا ہے، یہ نسخہ جو سفید عمدہ کاغذ پر چھپا ہے۔ مطبع سلطانی، قلعہ معلی دہلی سے سنہ (۱۲۵۶ھ/ ۱۸۴۰ء) شائع ہوا تھا لیکن حضرت شاہ محمد اسحاق اس کی طباعت کے بعد جلد ہی ہندستان سے مکہ معظمہ ہجرت کر گئے تھے، اس لیے حضرت شاہ محمد اسحاق کے اس مشن اور علم کو حضرت شاہ صاحب کی ہدایت اور وصیت کے مطابق حضرت مولانا احمد علی نے سنبھالا اور اس شان سے بلند رکھا کہ پوری دنیا میں خدمت حدیث کا آوازہ گونج گیا۔

حضرت مولانا احمد علی کی حدیث شریف کی اس خدمت کو ماشاء اللہ ایسی مقبولیت و پذیرائی ہوئی جو کسی اور کو آج تک حاصل نہیں ہوئی، برصغیر ہند بلکہ مشرقی ایشیائی ملکوں کا حدیث شریف کا کون طالب علم اور خادم ہے، جس نے حضرت مولانا کی مرتبہ اور شائع کی ہوئی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ترمذی، سنن ابو داؤد اور مشکوٰۃ المصابیح سے استفادہ نہ کیا ہو؟ حضرت مولانا کی شائع کی ہوئی کتابوں کو کچھ ایسی پذیرائی حاصل ہوئی کہ وہ سنہ (۱۲۵۶ھ/ ۱۸۴۸ء) سے آج تک مقبول خاص و عام ہیں اور بلا استثنا ہر طبقے کے علما اور طلبہ کے لیے سرمۂ بصیرت بنی ہوئی ہیں۔

حضرت مولانا نے کتب حدیث خصوصاً صحاح ستہ کی مرکزی کتابوں کی اشاعت کا اس وقت منصوبہ بنایا تھا اور اس کو نہایت شایان شان طریقے پر پورا کیا تھا، جب عالم اسلام میں ان میں سے کسی بھی کتاب کی اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ حضرت مولانا نے اگر چہ اپنے کام کی ابتدا صحیح بخاری کی تصحیح و تعلیق اور اشاعت سے کی تھی، مگر سب سے پہلے سنہ ۱۲۵۶ھ میں سنن ترمذی کی اشاعت مکمل ہوئی، پھر ۱۲۶۷ھ میں صحیح بخاری کی پہلی جلد زیور طباعت سے آراستہ ہو کر آئی، بعد ازاں صحیح مسلم کا مکمل نسخہ دو جلدوں میں، جس پر امام نووی کی شرح بھی ہے جلوہ افروز ہوئی۔ سنہ ۷۲-۱۲۷۱ھ میں سنن ابو داؤ کے نہایت صحیح اور اعلیٰ نسخے کی طباعت کا اہتمام فرمایا۔ دیگر کتابوں میں سنہ ۱۲۷۰ھ میں مشکوۃ المصابیح کا نہایت عمدہ نسخہ مفصل حاشیے سے آراستہ ہو کر نمودار ہوا۔ اسی سال میں حصن حصین کی عمدہ حاشیہ کے ساتھ اشاعت کی۔ اسی سنہ ۱۲۷۱ھ میں شیخ الاسلام حافظ ابن حجر کی تقریب التہذیب کی اشاعت کا اہتمام کیا۔

> اس محنت اور دیدہ ریزی کی وجہ سے حضرت مولانا احمد علی کا مرتبہ صحیح بخاری کا نسخہ فربری کی روایت پر مبنی صحیح بخاری کے ائمہ محدثین کے تمام نسخوں کی خوبیوں کا جامع اور اختلاف روایت کا ایسا بہتر ذخیرہ ہوگیا ہے کہ اس کے بعد مزید تحقیق و تنقیح کی زیادہ ضرورت نہیں رہی اور حضرت مولانا کے پیش نظر تمام انیس نسخوں کی جزئیات اور اختصاصات اس نسخہ میں اس طرح شامل بلکہ جذب ہو گئے ہیں کہ حضرت مولانا کے مرتبہ نسخہ کے آئینہ میں تمام سابقہ نسخوں کے امتیازات و اختلافات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

اسی دوران رسالہ اصول حدیث سید شریف جرجانی اور علامہ شیخ عبدالحق کا مقدمہ بھی شائع کیا۔ یہ اشاعتیں ان تمام کتابوں کی عالم اسلام میں پہلی اشاعت تھیں۔ اگر چہ اس سے پہلے یورپ میں بخاری شریف کے چند اجزا شائع ہو چکے تھے مگر ان میں وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی!

اس مقصد کے لیے حضرت مولانا نے سب سے پہلے ایک بڑے مطبع کا بندوبست کیا۔ دہلی میں حضرت مولانا کے استاذ مولانا وجیہ الدین سہارن پوری کا ایک مطبع تھا، جو مطبع احمدی کے نام سے کام کر رہا تھا، حضرت مولانا نے اس کو خرید لیا اور اس سے اپنی کتابوں کی طباعت کا سلسلہ شروع کیا اور اس مطبع کو اس قدر ترقی دی کہ کام کی وسعت اور بڑی کتابوں کی طباعت کے انصرام میں شمالی ہند کا کوئی اور مطبع اس کے ہم پایہ نہیں تھا۔ اگر چہ اس مطبع سے اور حضرت مولانا احمد علی کی تصحیح و اہتمام سے اور بھی متعدد موضوعات کی بیسوں پچاسوں کتابیں شائع ہوئیں۔ یہاں حدیث شریف کی ان چند اہم مطبوعات کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو برصغیر ہند کی علمی تاریخ کا ایک سنہرا اور نہایت درخشاں عنوان ہیں، حضرت مولانا نے جو کتابیں مرتب و مدوّن کر کے اور ان پر وقیع عالمانہ حاشیے لکھ کر چھپوائیں۔ ان میں سب سے پہلی کتاب سنن ترمذی ہے، اس کے بعد صحیح بخاری، مشکوۃ المصابیح، صحیح مسلم مع نووی اور ان کے بعض متعلقات و ضمیمے شائع ہوئے، جس میں سب سے زیادہ توجہ اور اہمیت قدرتی طور پر صیح بخاری کو حاصل رہی اور حق بھی یہی ہے کہ تمام کتب حدیث میں سب سے پہلے صحیح بخاری کا تذکرہ ہو، اور اس پر جہاں تک ممکن ہو توجہ کی جائے، اس لیے آئندہ صفحات میں بھی سب

سے پہلے حضرت مولانا احمد علی کے مرتبہ صحیح بخاری، اس کے حواشی، ان کے مختلف پہلوؤں اور متعلقات کا تذکرہ ہے اس کے بعد اور کتابوں کا مختصر تذکرہ کیا جارہا ہے۔

صحیح بخاری کی تصحیح وتحقیق متن اور حاشیہ وغیرہ

صحیح بخاری، قرآن مجید کے بعد امت مسلمہ کا سب سے اہم ممتاز ترین، اعلیٰ ترین اور معتمد ترین مرجع ہے، جس کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا شرف وامتیاز حاصل ہے۔ سیرت پاک کے تمام پہلوؤں، فرائض وعبادات کے تمام گوشوں اور امت کے جملہ دینی معاملات ومسائل میں سب سے پہلے بخاری شریف سے مراجعت واستفادہ کیا جاتا ہے، اور جو کتاب اس غیر معمولی بلند مقام پر فائز ہو اور امت کے مسائل وعقائد کی اساس وبنیاد ہو، اس کے متن کی صحت، اس کے مقابلہ وتصحیح کی ضرورت اور اس میں صحیح ترین الفاظ و کلمات کا انتخاب کس درجہ ضروری ہے محتاج بیان نہیں، نیز اس کے نکات ودقائق کے حل، اس کی مشکلات ومبہمات کی تنقیح، اس کے مطالب ومندرجات کی توضیح کی کس حد تک ممکن سے ممکن کوشش کی جانی چاہیے، اس میں بھی گفتگو کی گنجائش نہیں۔

بخاری شریف کی تصحیح کا معاملہ اور کتابوں کی تصحیح وتدوین سے کہیں زیادہ اہم، نازک، پیچیدہ اور غیر معمولی اہمیت کا کام ہے، اس کے لیے حضرت مولانا نے وہ تمام کوششیں اور اہتمامات فرمائے جو اس بڑے کام کے لیے ضروری اور شایان شان تھے۔ حضرت مولانا نے بخاری شریف کے متن کی تعیین کے لیے اس نسخے کو بنیاد بنایا ہے جو علامہ یونینی کا مرتب کیا ہوا ہے۔ حضرت مولانا نے اس نسخے کو سامنے رکھ کر فقط تصحیح کر کے شائع نہیں کر دیا، بلکہ حضرت مولانا نے اس نسخے کے کامل استناد اور اعلیٰ ترین تدوین وترتیب کے لیے بخاری شریف کے نسخۂ فربری کی تمام روایتوں اور حضرات محدثین کرام کے مرتب کیے ہوئے تمام نسخوں سے کامل استفادہ کیا۔ حضرت مولانا نے اس مقصد کے لیے بخاری شریف کے انہیں اہم ترین ممتاز نسخوں کو سامنے رکھا ہے اور ان تمام نسخوں کا بخاری شریف کے مقدمے میں صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

ان نسخوں کے حضرت مولانا کے پیش نظر موجود بنیادی نسخے سے جو اختلافات ہیں، حضرت مولانا نے ان سب کو اپنے مرتبہ نسخے میں اس طرح جمع کیا ہے کہ کوئی اختلاف لفظ، اختلاف روایت وکلمہ ایسا باقی نہیں رہا جس کو حضرت مولانا نے حاشیے میں نسخ کے ذیل میں پوری وضاحت اور مکمل حوالہ کے ساتھ درج نہ کیا ہو، اگر کوئی کلمہ کسی ایک محدث کی ترجیح ہے یا صرف ایک ہی نسخے میں درج ہے تو اس کی بھی صراحت کی ہے اور مرجع کا حوالہ دے دیا ہے اور اگر کسی ایک لفظ وعبارت پر دو تین یا چار پانچ یا زائدہ نسخے متفق ہیں تو ان سب کا بھی علاحدہ علاحدہ مفصل حوالہ یکجا درج کیا ہے اور اگر کوئی لفظ ایسا ہے کہ متعدد اصحاب نسخہ نے اس پر اعتماد کیا ہے مگر حضرت مولانا دلائل وشواہد کی وجہ سے اس کو ثانوی درجہ کا سمجھتے ہیں تو ان کا بھی تذکرہ ہے۔

اس محنت اور دیدہ ریزی کی وجہ سے حضرت مولانا احمد علی کا مرتبہ صحیح بخاری کا نسخہ فربری کی روایت پر مبنی صحیح بخاری کے ائمہ محدثین کے تمام نسخوں کی خوبیوں کا جامع اور اختلاف روایت کا ایسا بہتر ذخیرہ ہوگیا ہے کہ اس کے بعد مزید تحقیق وتنقیح کی زیادہ ضرورت نہیں رہی اور حضرت مولانا کے پیش نظر تمام انیس نسخوں کی جزئیات اور اختصاصات اس نسخہ میں اس طرح شامل بلکہ جذب ہو گئے ہیں

کہ حضرت مولانا کے مرتبہ نسخہ کے آئینہ میں تمام سابقہ نسخوں کے امتیازات و اختلافات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور ان پر چند اضافات اور اہتمامات کا بھی، یعنی یہ نسخہ ان سب کی خصوصیات کا نمائندہ و ترجمان بھی ہے اور ان سے ممتاز و الگ بھی:

شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم

تفہیم متن کے لیے بعض وضاحتیں

حضرت مولانا نے بخاری شریف کی تصحیح میں صرف صحیح نسخے کی ترتیب پر اپنے کام کو ختم نہیں کر دیا ہے بلکہ اس نسخے کو قارئین کے لیے آسان اور مفید ترین بنانے کے لیے جو صورت ہو سکتی تھی اس کا بھی پورا اہتمام فرمایا ہے، مثلاً اگر بخاری شریف کی کسی عبارت کی تعیین یا تکمیل و تخفیف میں بخاری شریف کے قدیم معروف نسخے اور شارحین بخاری کی اطلاعات مختلف ہیں، اس عبارت و روایت کے چند الفاظ و کلمات کسی ایک نسخے یا نسخوں میں شامل ہیں لیکن اور نسخے اس سے اتفاق نہیں کرتے، یا شراح بخاری نے یہاں کسی

> مطبع احمدی سے بخاری شریف جلد اول کی پہلی طباعت، رجب سنہ ۱۲۶۷ھ (مئی ۱۸۵۱ء) میں مکمل ہوئی، اسی وقت دوسری جلد کی طباعت کا آغاز ہو گیا تھا، جو محرم الحرام سنہ ۱۲۷۰ھ (سنہ ۱۸۵۳ء) میں مکمل ہوا۔ خیال رہے کہ عالم اسلام میں بخاری شریف اس طباعت کے تئیس سال بعد سنہ ۱۲۹۲ھ میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی۔

لفظ یا فقرے کی کمی زیادتی یا عبارت کی ترتیب میں اختلاف کا ذکر کیا ہے، ایسے موقعوں پر حضرت مولانا نے اس فقرے کی ابتداء اور خاتمہ دونوں پر ''صح'' کا اشارہ دے دیا ہے۔

لیکن حضرت مولانا کی ترتیب میں یہ اس قسم کا واحد اشارہ یا وضاحت نہیں ہے، حضرت مولانا نے اور بھی کئی رموز یا علامتیں کئی طرح کی وضاحتوں کے لیے مقرر فرما رکھی ہیں۔ حضرت مولانا نے عطف، معطوف علیہ، لاحق و سابق، جار مجرور ہر ایک کے لیے علاحدہ نشانات مقرر فرمائے ہیں اور اس کی ممکنہ کوشش کی ہے پڑھنے والوں کو غلطی اور التباس نہ ہو۔

حضرت مولانا کے حاشیہ کی ترتیب، اس کے چند امتیازات اور طریقۂ کار

متن کتاب مکمل ہونے کے بعد دوسرا اہم بلکہ اہم ترین مرحلہ کتاب کے نکات و مبہمات کی توضیح، علمی وفنی دقائق کے حل، باریکیوں اور مباحث کی تفصیل وتخصیص کا ہے۔ حضرت مولانا نے جو اس بے پایاں دریا کی وسعت و گہرائی سے آشنا تھے، اس کو بہتر سے بہتر طریقہ پر مکمل کرنے کا ارادہ فرما لیا اور پوری کتاب پر (آخری غالباً تین پاروں کے علاوہ) نہایت جامع اور مکمل حاشیے تحریر فرمائے ہیں۔

حضرت مولانا کا طریقۂ کار یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اوّل ان مقامات کو نشان زد فرماتے ہیں، جن کی شرح وتفہیم کے لیے رہنمائی کی ضرورت ہے، پھر اپنے سامنے موجود جملہ شروحات، کتب حدیث اور متعلقات کو ملاحظہ فرما کر یہ طے کرتے ہیں کہ اس عبارت و بحث کی تفصیل وتحقیق کے لیے سب سے بہتر گفتگو کس عالم وشارح نے فرمائی ہے، پھر اس کتاب سے اخذ و اقتباس کر کے، حسب

ضرورت مفصل یا مختصر حاشیہ درج فرما دیے ہیں، جو مقامات مفصل بحث کے طالب نہیں وہاں مختصر بات فرماتے ہیں، جن مقامات کی وضاحت ضروری ہے، وہاں حسب ضرورت متوسط یا مفصل حاشیہ تحریر ہوگا۔اس حاشیہ نویسی میں بھی دو طریقے ہیں، کبھی خود کچھ تحریر فرما کر اپنے مآخذ کا اشارہ وتذکرہ فرما دیتے ہیں، جہاں اس سے بات نہ بنے وہاں مفصل بلکہ مفصل ترین حاشیہ درج ہوگا، اس تفصیل میں بھی کئی پہلو نظر آتے ہیں، کبھی دو تین یا زائد کتابوں سے مختصر مختصر مگر جامع اقتباسات ایسی خوبصورت ترتیب سے درج فرمائیں گے جس سے متعلقہ بحث وگفتگو آئینہ ہو جائے، کبھی ایک ہی کتاب کے نسبتاً مفصل اقتباس پر اکتفا کریں گے۔کئی مرتبہ ایک اور صورت اختیار فرماتے ہیں کہ کسی ایک شارح یا محقق کی تحریر پر مشتمل مفصل بحث کو جو دو چار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، اپنے الفاظ میں درج فرمائیں گے اور اس مفصل بحث کا اس طرح عرق کشید فرمائیں گے یا جوہر کھینچ لیں گے کہ عبارت مختصر سے مختصر ہو جائے مگر بحث واصل کا کوئی ضروری حصہ باقی نہ رہے، یہ حضرت مولانا کا ایک خاص وصف ہے جس کا حواشی بخاری میں پچاسوں سینکڑوں مقامات پر اظہار ہوا ہے۔

اس سے پہلے کہ حضرت مولانا کی آخری مکمل نظر ثانی، ترمیمات واضافہ والا نسخہ شائع ہوتا، سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک شروع ہوگئی، جس کی زد میں حضرت مولانا کا مطبع بھی آیا، اس کا تمام موجود علمی سرمایہ چھپی ہوئی کتابوں کے تمام نسخے اور حضرت مولانا کا نہایت قیمتی ذاتی کتب خانہ اس طرح خراب و برباد ہوا کہ ایک کتاب بلکہ ورق بھی محفوظ نہیں رہا۔ حضرت مولانا سہارن پور تھے کہ یہ سانحہ پیش آگیا۔

کہیں یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی کتاب یا شرح کے پہلو یا گوشہ کی طرف اشارہ مقصود ہو، اس وقت تمام مندرجات کا احاطہ اور عبارت نقل کرنے کا اہتمام نہیں فرماتے، اس کا اشارہ اپنے الفاظ میں فرما کر آخر میں اس کا مختصر حوالہ ذکر فرما دیتے ہیں۔

حضرت مولانا کے حاشیے میں یہ بات بطور خاص محسوس کی جاسکتی ہے کہ مصنف ومرتب نے اس حاشیے کو بوجھل بنانے سے احتیاط برتی ہے، حضرت مولانا صرف ایسے موقعوں پر حسب ضرورت مفصل یا مختصر حاشیہ تحریر فرماتے ہیں، جہاں اس سے متعلقہ عبارت کو حل کرنے میں واقعتاً خاص مدد ملتی ہو یا اس کی عمدہ گرہ کشائی متوقع ہو، موقع بے موقع حاشیہ کا اہتمام کرنا حضرت مولانا کا مزاج نہیں۔ساتھ ہی یہ بھی اہتمام رہتا ہے کہ کسی ایک مسئلہ یا بحث پر جہاں تک ممکن ہو مکرر گفتگو نہ کی جائے، حاشیہ نہ لکھا جائے، اس میں اس کا بھی اہتمام رہتا ہے کہ جہاں اس حاشیہ یا بحث کی بطور خاص ضرورت ہے، حاشیہ اسی مقام پر رقم ہوگا، اگر یہ الفاظ وکلمات اس سے پہلے بھی کہیں آئے ہیں، مگر وہاں ضمناً تھے تو وہاں حاشیہ نہیں ہوگا، وہاں لکھ دیں گے کہ یہ گفتگو یا بحث فلاں باب کے تحت فلاں جگہ آرہی ہے، جس میں کہیں کہیں صفحات کی بھی صراحت ہوتی ہے، جہاں موقع آئے گا، وہاں کسی قدر وضاحت سے اپنے اصول وطریقۂ کار کی پاسداری کرتے ہوئے حاشیہ تحریر فرمائیں گے اور یہ صراحت بھی کردیں گے کہ یہ بات اگرچہ فلاں فلاں موقع پر گزر چکی ہے مگر اس پر گفتگو کا موقع یہ ہے، اس کے بعد بھی اگر کہیں اعادہ ہوتا ہے تو گزشتہ باب کا حوالہ دیا جائے گا کہ یہ بحث وتحقیق فلاں باب یا عنوان کے

تحت گزر گئی ہے۔

حواشی بخاری میں حضرت مولانا کے مآخذ

حضرت مولانا نے بخاری کے مقدمے میں اپنے حواشی کی تصنیف میں اپنی معاون کتابوں کی فہرست درج کی ہے، جو پینسٹھ کتابوں پر مشتمل ہے، اس میں بخاری شریف کی گیارہ، مشکوۃ المصابیح نیز موطاً امام مالک کی چھ شروحات شامل ہیں، لیکن یہ حضرت مولانا کے مراجع کی مکمل فہرست نہیں ہے۔ اس کا نہ صرف اس فہرست کے اختتام پر وغیر ذلک کے لاحقہ سے اندازہ ہوتا ہے، بلکہ بخاری شریف کا سب سے پہلا حاشیہ بھی اس کی پردہ کشائی کر دیتا ہے کہ حضرت مولانا نے اپنے متعدد مآخذ کا اس فہرست میں ذکر نہیں فرمایا۔ سب سے پہلے حاشیے میں حضرت شاہ ولی اللہ کی ایک عبارت سے استدلال ہے جو کہ مسویٰ کی نہیں ہے، جب کہ مسویٰ حضرت شاہ ولی اللہ کی واحد کتاب ہے جس کا حضرت مولانا نے اپنے مآخذ میں ذکر کیا ہے، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کے چند مراجع اور مآخذ اور بھی ہوں گے جن کا حضرت مولانا کی فہرست و مآخذ میں تذکرہ نہیں ہے۔

اطراف بخاری کی وضاحت و نشان دہی

حضرت امام بخاریؒ کا ایک خاص معمول یہ بھی ہے کہ وہ متعدد احادیث کو اپنی خاص ذہنی ترتیب اور اس حدیث سے ماخوذ مختلف مسائل و نکات کی وجہ سے بخاری شریف میں مختلف ابواب میں علاحدہ علاحدہ موضوعات کے تحت درج فرما دیتے ہیں، جس میں کئی مرتبہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک حصہ ایک باب اور موضوع میں آئے گا، دوسرا حصہ یا ٹکڑا کسی اور باب میں پیش فرمائیں گے، ایسی صورت میں بخاری شریف سے عام استفادہ کرنے والے تو کہاں، کئی مرتبہ فاضل اساتذہ اور اہل نظر بھی ایسی تمام معلومات کو مستحضر رکھنے میں دشواری محسوس فرماتے ہیں کہ حضرت امام نے اس روایت سے کہاں کہاں کس مسئلے پر کس کس طرح استدلال فرمایا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ روایت کے ہر ایک ٹکڑے کے ساتھ یہ صراحت ہو کہ یہ روایت یا اس کا کوئی حصہ، فلاں کتاب میں فلاں موضوع اور عنوان کے تحت گزر گیا ہے۔ حضرت مولانا احمد علی صاحب نے اس کی نشان دہی کا اہتمام کیا ہے، جو حصہ گزر گیا ہے اس کا بھی ذکر ہے "مر في باب فلاں" اور جو حصہ یا پہلو کہیں آنے والا ہے، اس کی تصریح ہے "سيجيئ في باب فلاں" اس کا پہلے صفحہ سے آخر تک مکمل اہتمام کیا گیا ہے۔

بخاری شریف کے اس نسخہ کی پہلی طباعت

حضرت مولانا نے جلد اول کی تصحیح، حاشیہ اور کتابت و مقابلہ کا نہایت دشوار گزار مرحلہ مکمل ہونے کے بعد جلد اوّل کی طباعت کا اہتمام کیا۔ پہلی جلد کی پہلی طباعت کی، سید عبد الغفور (برادر سر سید احمد) کے مطبع سید الاخبار دہلی میں ۱۸/ جمادی الآخر سنہ ۱۲۶۴ھ (مئی/ ۱۸۴۸ء) میں ابتداء ہوئی، مگر طباعت کی رفتار بہت سست تھی، چھ مہینہ میں (ذی الحجہ ۱۲۶۴ھ تک)، فقط ایک سو چوراسی (۱۸۴) صفحات چھپے تھے۔ ادھر حضرت مولانا کا مرتبہ سنن ترمذی کا نسخہ مع حواشی

کے مکمل ہو چکا تھا، اس لیے حضرت مولانا نے بخاری شریف کی طباعت کا کام وقتی طور پر روک کر سنن ترمذی کی طباعت مطبع العلوم دہلی سے شروع کرادی تھی، سنن ترمذی کی طباعت جاری تھی کہ حضرت مولانا کے اپنے ذاتی پریس، مطبع احمدی کا انتظام ہوگیا، اس لیے اب حضرت مولانا کی کتابوں صحیح بخاری اور سنن ترمذی، دونوں کی طباعت مطبع احمدی میں منتقل ہوگئی، اس طرح مطبع احمدی سے بخاری شریف جلد اول کی پہلی طباعت، رجب سنہ ۱۲۶۷ھ (مئی ۱۸۵۱ء) میں مکمل ہوئی، اسی وقت دوسری جلد کی طباعت کا آغاز ہو گیا تھا، جو محرم الحرام سنہ ۱۲۷۰ھ (سنہ ۱۸۵۳ء) میں مکمل ہوا۔ خیال رہے کہ عالم اسلام میں بخاری شریف اس طباعت کے تئیس سال بعد سنہ ۱۲۹۲ھ میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی۔

پہلی طباعت کے صرف تین سو پچیس نسخے چھپے تھے، جس پر فی نسخہ اٹھارہ روپے خرچہ آیا تھا، فی جز پانچ روپے آٹھ آنہ کاتب کی اجرت تھی، تین روپے بارہ آنہ کا کاغذ لگا تھا، چار روپے آٹھ آنہ طباعت کے دیے گئے، بارہ آنہ کا متفرق صرفہ ہوا تھا، پچیس روپے اس کی قیمت رکھی گئی تھی جو اس وقت کے لحاظ سے ایک بہت بڑی رقم تھی، پچیس روپے ایک گھرانہ کے اوسط سے بہتر ماہانہ اخراجات تھے، جس میں اچھی طرح گزر بسر ہو جاتی تھی مگر اس بڑی قیمت کے باوجود، بخاری شریف کی طلب اس قدر تھی اور خریدار اس درجہ مشتاق اور تشنہ لب تھے کہ عام لوگوں کی استطاعت اور قوت خرید سے کہیں زیادہ قیمت کے باوجود کتاب بہت جلد، تیزی سے فروخت ہوئی اور غالباً اسی سال اس کی دوسری طباعت کی ضرورت پیش آ گئی تھی، اس کے بعد سے جو اس کی طباعت و فروخت کا سلسلہ شروع ہوا تو دس سال کے قلیل عرصہ میں آٹھ سے زائد ایڈیشن چھپے، جو حضرت مولانا کے علاوہ دہلی بمبئی وغیرہ کے مختلف مطابع نے شائع کیے۔

نسخہ حضرت مولانا احمد علی کی مکمل اور نظر ثانی شدہ اشاعت

پہلی طباعت کے بعد ہی حضرت مولانا نے اس نسخے کی تصحیح مزید اور نظر ثانی کا کام شروع کر دیا تھا، دوسری اشاعت میں جس کا ذکر ہوا، مقدمہ شامل کیا گیا تھا، اس کے بعد کی کئی طباعتیں چوں کہ حضرت مولانا کے علاوہ اور علما اور مطابع کے ذریعہ سے عمل میں آئی تھیں، اس لیے ان میں حضرت مولانا کی نظر ثانی یا کوئی اضافہ و ترمیم شامل نہیں لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت مولانا نے جس کام کو مقصد حیات بنا کر شروع کیا تھا، اس سے غفلت فرماتے، مگر اس سے پہلے کہ حضرت مولانا کی آخری مکمل نظر ثانی، ترمیمات و اضافہ والا نسخہ شائع ہوتا، سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک شروع ہوگئی، جس کی زد میں حضرت مولانا کا مطبع بھی آیا، اس کا تمام موجود علمی سرمایہ چھپی ہوئی کتابوں کے تمام نسخے اور حضرت مولانا کا نہایت قیمتی ذاتی کتب خانہ اس طرح خراب و برباد ہوا کہ ایک کتاب بلکہ ورق بھی محفوظ نہیں رہا۔ حضرت مولانا سہارن پور تھے کہ یہ سانحہ پیش آگیا، اب دہلی جانے اور مطبع کے دوبارہ زندہ کرنے کا موقع نہیں تھا، تاہم حضرت مولانا کی صحیح بخاری سے گہری وابستگی بدستور قائم رہی، غالباً اسی دوران حضرت مولانا نے دہلی کے مطبوعہ نسخوں پر نئے سرے سے محنت کی، پہلی طباعتوں کے متن میں کتابت وطباعت کی جو غلطیاں رہ گئی تھیں، ان کی موقع پر تصحیح فرمائی، حاشیہ پر بھی مکمل نظر ثانی فرمائی، حاشیوں کی بعض

عبارتوں میں کچھ تبدیلی کی، مراجع کی مزید تحقیق وتنقیح فرمائی، بعض حاشیے اور حوالے اضافہ کیے، بعض کو قلم زد فرمایا۔

رجال بخاری کا اضافہ

بخاری کی اب تک کی کسی بھی طباعت میں رجال صحیح بخاری کا تعارف اور تذکرہ درج نہیں تھا، اس طباعت کے لیے حضرت مولانا نے رجال بخاری کا اضافہ فرمایا جس میں حسب ضرورت، رواۃ کے صرف نام ونسب یا نسبت وکنیت کی مختصر بلکہ مختصر ترین وضاحت کی گئی ہے، مگر اس وقت غالباً اس کی تکمیل نہیں ہوسکی، یہ صرف نصف اول پر ہے، نصف ثانی اس اضافے سے محروم ہے، نصف ثانی کے تراجم بعد میں مکمل ہوئے جو صحیح بخاری کی اس طباعت میں شامل وشائع کیے گئے جو بہت اہتمام سے حضرت مولانا کے علمی جانشین، بڑے فرزند، مولانا حبیب الرحمن نے مطبع مصطفائی کان پور سے سنہ ۱۳۰۸ھ میں شائع کیا تھا۔

حضرت مولانا احمد علی نے اپنے طریقۂ کار کے مطابق مشکوٰۃ المصابیح کو بھی مرتب کیا اور اس پر بھی اور کتابوں کی ترتیب پر مفصل جامع حاشیہ لکھا، اس کا طریقۂ کار بھی تقریباً وہی ہے جو صحیح بخاری اور سنن ترمذی کے حاشیہ کا ہے۔ مشکوٰۃ المصابیح کا یہ نسخہ اور کتابوں کی نسبت زیادہ مقبول ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں چھپا، تیسرا ۱۲۷۲ھ میں (۱۸۵۶ء) میں۔ اس کے بعد ایک مرتبہ حضرت مولانا کے مطبع احمدی میرٹھ سے بھی چھپا اور اس وقت سے آج تک متواتر چھپ رہا ہے۔

حضرت مولانا کے مرتبہ نسخہ کی مکمل اور نظر ثانی شدہ اشاعت میرٹھ ۱۲۸۳ھ

حضرت مولانا کا مطبع احمدی دہلی کے ہنگامے سنہ ۱۸۵۷ء میں تباہ ہوکر بے نام ونشان ہوگیا تھا مگر اس کام کی تکمیل باقی تھی جس کے لیے حضرت مولانا نے اس مطبع کو اساس بنایا تھا، اس لیے اس حادثے کے تقریباً آٹھ سال بعد، سنہ ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) میں حضرت مولانا نے مطبع کے اسی پرانے نام مطبع احمدی کو میرٹھ میں دوبارہ قائم کیا، جس کی ابتدائی مطبوعات میں بخاری کا حضرت مولانا کی آخری تصحیح ونظر ثانی والا نسخہ بھی شامل تھا۔ اس نسخے کی مطبع احمدی میرٹھ سے سنہ ۱۲۸۲ھ میں طباعت شروع ہوکر ۱۲۸۳ھ (۶۶-۱۸۶۵ء) میں مکمل ہوئی، یہی وہ نسخہ ہے جو بعد میں ہندوستان کے مختلف مطابع نے کثرت سے بلکہ پچاسوں مرتبہ شائع کیا۔ یہ بات اہل علم نے برملا کہی ہے کہ مطبع مصطفائی کانپور کا سنہ ۱۳۰۸ھ (۱۸۹۱ء) میں چھپا ہوا نسخہ سب سے بہتر اور صحیح ترین نسخہ ہے، اس کے بعد اصح المطابع دہلی کا ۱۳۵۷ھ (۱۹۳۸ء) شائع نسخہ سب سے عمدہ اور بہتر اشاعت قرار دیا جاتا ہے، اس وقت عموماً اَصح المطابع کے نسخہ کاری پرنٹ (Re-Print) یا عکس چھپتا ہے، نئی کتابت یا صحیح مزید کی اس کے بعد کوئی کوشش نہیں ہوئی لیکن یہاں یہ عرض کر دینا چاہیے کہ نسخہ اَصح المطابع میں شامل حل لغات اور حضرت شاہ ولی اللہ کا رسالہ ''الابواب والتراجم'' حضرت مولانا احمد علی کی مطبوعہ ومرتبہ کسی طباعت میں شامل نہیں، یہ اصح المطابع کا اضافہ ہے، اس صحیح بخاری کے حاشیہ کی تصحیح ومقابلہ پر حضرت مولانا احمد علی نے بیس سال سے زیادہ وقت صرف کیا مگر اس بے مثال کوشش اور صحیح کے نادر اہتمام کے باوجود، کاتبوں کی عنایات اور شاید کہیں کہیں سہو

ناقل سے بھی مختلف قسم کی غلطیاں ہوگئی ہیں، چوں کہ معاملہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا تھا، اس لیے مئوضلع اعظم گڑھ کے ایک عالم مولانا عبدالجبار مئوی (شاگرد حضرت مولانا عبدالغفار صاحب مئو) نے بہت عمدہ دیدہ ریزی سے ان حواشی کی متعلقہ مراجع اور کتب رجال وغیرہ سے تصحیح کی تھی، جو صحیح بخاری کی مناسبت سے اسی پیمائش کے دو مختصر حصوں میں چھپی ہے، یہ کام اگرچہ ایک درجہ میں غیر معمولی اور نہایت اہم ہے مگر نا تمام ہے، کیوں کہ مولانا عبدالجبار صاحب کو حضرت مولانا کے متعدد اصل مراجع (بعض مطبوعہ بھی) دستیاب ہی نہیں ہوئے، اس لیے ان سے مراجعت اور تصحیح کی تمنا باقی رہی اور اب بھی باقی ہی ہے۔ و للہ الأمر من قبل و من بعد۔ یہ سعادت محدث جلیل حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری کے مقدر میں لکھی تھی۔ انھوں نے بڑے اہتمام سے مکمل مراجعت و تصحیح کا بیڑہ اٹھایا اور اب بخاری شریف کا صحیح ترین نسخہ ان کی تحقیق و تعلیق سے پندرہ جلدوں میں بیروت سے شائع ہو کر مقبول خاص وعام ہو رہا ہے۔

صحیح مسلم کی شرح نووی کے ساتھ اشاعت ۱۲۷۰ھ

حضرت مولانا بخاری شریف کی طباعت کے دوران ہی صحیح مسلم کا محقق نسخہ بھی مرتب فرما چکے تھے، مگر اس پر خود حاشیہ نہ لکھ کر حاشیہ پر حضرت امام نووی کی بابرکت شرح شائع فرمانے کا منصوبہ بنایا، صحیح مسلم کے اس نسخہ کی طباعت، بخاری شریف کی جلد ثانی کی طباعت مکمل ہونے سے پہلے تقریباً سنہ ۱۲۶۹ھ میں شروع ہوگئی تھی، اس کا حضرت مولانا نے بخاری شریف کے جلد ثانی کے خاتمے میں اعلان بھی کر دیا تھا۔ اس اعلان کے مطابق نسخہ غالباً سنہ ۱۲۷۰ھ کے قریب شائع ہوگیا تھا اور اس قدر مقبول ہوا کہ صحیح بخاری کی پہلی طباعت کی طرح اس کے نسخے چند دنوں میں ختم بلکہ ناپید ہو گئے تھے (یہ طباعت اس درجہ کم یاب ہے کہ راقم سطور کو خاصی تلاش کے باوجود اس کے کسی نسخے کا سراغ نہیں ملا) مگر کتاب کی طلب اسی طرح باقی تھی۔ اس لیے حضرت مولانا نے اس کی دوسری طباعت پر فوراً توجہ کی، جو حضرت مولانا کے ایک شاگرد، مولانا محمد حسین فقیر (بنتی دہلوی) کی تصحیح، حضرت کے اہتمام وانصرام سے مطبع أفضل المطالع، شاہدرہ دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کے آغاز پر حضرت مولانا احمد علی نے حضرت شاہ محمد اسحاق سے اپنی سند درج کی ہے، آخر میں مولانا محمد حسین فقیر کے قلم سے اختتامیہ ہے، سنہ طباعت درج نہیں، قیاساً ۷۲-۱۲۷۱ھ (۵۶-۱۸۵۵ء) کی طباعت ہے۔

حضرت مولانا کے چھوٹے بھائی اور ناظم مطبع، شیخ ظفر علی کے اہتمام سے صحیح مسلم کا یہی نسخہ جس کے حاشیہ پر شرح نووی ہے، آج تک اسی طرح اسی ترتیب بلکہ تقریباً اسی طرز کتابت پر شائع ہو رہا ہے اور حضرت مولانا کی حسنات میں اضافہ کر رہا ہے۔

سنن ترمذی کا حاشیہ اور طباعت ۱۲۶۵ھ

حضرت مولانا نے صحیح بخاری کے حاشیہ کی ترتیب وتدوین کے ساتھ ہی سنن ترمذی پر بھی کام شروع کر دیا تھا، اس پر بھی حضرت مولانا نے حاشیہ لکھا اور متن کی کسی قدر تصحیح کی، مگر سنن ترمذی کے حاشیہ اور تصحیح دونوں میں اس درجہ کا اہتمام نظر نہیں آتا جس کا حضرت مولانا نے صحیح بخاری میں التزام کیا ہے۔ ترمذی شریف کا یہ نسخہ جو غالباً سنہ ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) کے اواخر میں مکمل ہوگیا تھا

اور صفر سنہ ۱۲۶۵ھ (جنوری ۱۸۴۹ء) میں مطبع العلوم دہلی میں اس کی طباعت شروع ہوگئی، مگر جو صورت صحیح بخاری کی طباعت میں پیش آئی تھی یہاں اس سے سابقہ ہوا، طباعت کی رفتار بہت کم تھی اور خود حضرت مولانا کا مطبع بھی شروع ہو چکا تھا، اس لیے اس کی طباعت بھی مطبع احمدی میں منتقل ہوئی، صفر سنہ ۱۲۶۵ھ میں اس کی دونوں جلدوں کی طباعت مکمل ہوئی۔

اس نسخے کے متن کی تصحیح اور مقابلہ میں حضرت مولانا مملوک العلی، مولانا احمد علی کے رفیق و مددگار تھے، سنن ترمذی کا یہ نسخہ بھی حضرت مولانا کی مرتب اور شائع کی ہوئی کتابوں کی طرح مقبول خاص و عام ہوا اور آج تک اسی طرح چھپ رہا ہے۔

رسالہ اصول حدیث علامہ سید شریف جرجانی ۱۲۶۵ھ

حضرت مولانا نے صحیح بخاری کے آغاز پر ایک مفصل مقدمہ تحریر فرمایا تھا مگر سنن ترمذی کے لیے علاحدہ سے مقدمہ نہ لکھ کر اس کے مقدمہ کے طور پر علامہ سید شریف جرجانی کے رسالہ اصول حدیث کا انتخاب کیا، یہ رسالہ جو سنن ترمذی کی مذکورہ طباعت کے ساتھ چھپنا شروع ہوا تھا، آج تک اس کے ایک حصے کے طور پر شائع ہو رہا ہے۔

مشکوۃ المصابیح ۱۲۶۹ھ

حضرت مولانا احمد علی نے اپنے طریقۂ کار کے مطابق مشکوٰۃ المصابیح کو بھی مرتب کیا اور اس پر بھی اور کتابوں کی ترتیب پر مفصل جامع حاشیہ لکھا، اس کا طریقۂ کار بھی تقریباً وہی ہے جو صحیح بخاری اور سنن ترمذی کے حاشیہ کا ہے۔ مشکوۃ المصابیح کا یہ نسخہ اور کتابوں کی نسبت زیادہ مقبول ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں چھپا، تیسرا ۱۲۷۲ھ میں (۱۸۵۶ء) میں۔ اس کے بعد ایک مرتبہ حضرت مولانا کے مطبع احمدی میرٹھ سے بھی چھپا اور اس وقت سے آج تک متواتر چھپ رہا ہے۔

مقدمہ شیخ عبدالحق محدث ۱۲۶۹ھ

حضرت مولانا نے سنن ترمذی کے ساتھ علامہ سید شریف جرجانی کا رسالہ اصول حدیث شائع کیا تھا۔ اس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے مشکوٰۃ المصابیح کے آغاز پر شیخ عبدالحق محدث کا مقدمہ مشکوٰۃ المصابیح پہلی مرتبہ شائع کیا تھا۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ حضرت مولانا کا مرتبہ مشکوٰۃ المصابیح کا یہ نسخہ اور اس کے حاشیے دنیائے عرب میں متعارف تو پہلے بھی تھے اور ان کا تذکرہ بھی کیا جاتا تھا، مگر تقریباً دو سال پہلے ایک عرب فاضل رمضان بن احمد بن علی آل عوف العوف نے حضرت مولانا کے حواشی کو کسی قدر تعلیق و تحقیق کے بعد نسخہ قدیمہ ہندیہ کے نام سے چھ جلدوں میں شائع کر دیا ہے۔ چھٹی آخری جلد مؤلف مشکوٰۃ کی الاکمال فی اسماء الرجال اور فہارس پر مشتمل ہے۔ یہ نسخہ مکتبہ التوبہ اور دار ابن حزم بیروت سے سنہ ۱۴۲۳ھ/ ۲۰۰۳ء میں چھپا ہے۔ نہایت افسوس ہے کہ مرتب اور ناشر دونوں اس جلیل القدر حاشیے کے حاشیہ نگار حضرت مولانا احمد علی اور اس نسخے کے پس منظر سے واقف نہیں۔ سنا ہے کہ اس کے بعد حضرت مولانا کے حاشیہ صحیح بخاری پر بھی اسی قسم کا کام شروع ہوا ہے۔

حصن حصین ۱۲۷۱ھ

حضرت مولانا نے علامہ جزری کی حصن حصین کا بھی ایک عمدہ خوش قلم نسخہ جس پر مختصر افادات بھی درج ہیں، مطبع احمدی سے سنہ ۱۲۷۱ھ سے شائع کیا تھا، آخر میں قطعۂ تاریخ بھی درج ہے۔

تقریب التهذیب ۱۲۷۱ھ

رجال حدیث پر شیخ الاسلام حافظ ابن حجر کی مشہور کتاب تقریب التہذیب بھی سنہ ۱۲۷۱ھ میں اپنے مطبع سے شائع فرمائی تھی مگر اس نسخہ پر نہ کوئی مقدمہ ہے نہ حواشی لیکن سرورق پر اور آخر میں مطبع کا نام اور سنہ طباعت ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) درج ہے۔

موطا امام مالک کا یہ حاشیہ حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی نے لکھا تھا۔ حضرت مولانا کے مطبع احمدی دہلی سے سنہ ۱۲۶۶ھ میں پہلی مرتبہ شائع ہوا تھا۔ یہ موطا امام مالک کا وہی حاشیہ ہے جو عموماً تمام اہل درس اور طلبہ کے ہاتھوں میں رہتا ہے۔ ہندو پاکستان وغیرہ میں اس کی طباعت اور اس سے استفادہ حدیث شریف کے ہر ایک عالم و طالب علم کا گویا دائمی معمول ہے۔

سنن ابوداؤد ۱۲۷۱-۷۲ھ

حضرت مولانا نے جن کتابوں کی تصحیح وحاشیہ اور طباعت کا ارادہ کیا تھا، ان میں سنن ابوداؤ بھی شامل تھی۔ حضرت مولانا کو اس کا مکہ معظمہ میں قیام کے زمانے سے خیال تھا، اس مقصد کے لیے مکہ سے سنن ابوداؤد کا ایک نہایت عمدہ صحیح نسخہ ساتھ لائے تھے مگر یہاں آ کر تحقیق وحواشی اور طباعت واشاعت کے جس بڑے سلسلے کا آغاز ہوا اور اس میں حضرت مولانا کی جو بے پناہ مصروفیت رہی اس کی وجہ سے حضرت مولانا کو سنن ابوداؤد پر حاشیہ لکھنے کا موقع نہیں ملا اور اس نسخہ کی طباعت میں بھی تاخیر کا اندیشہ ہو گیا جو حضرت مولانا نے مرتب فرما رکھا تھا تو حضرت مولانا نے یہ خدمت اپنے استاذ حضرت شاہ محمد اسحاق کے ایک پرانے شاگرد اور دہلی کے مشہور عالم اور مدرس مولانا نوازش علی کے سپرد کر دی۔ مولانا نوازش علی نے اس خدمت کو توجہ اور اہتمام سے تکمیل تک پہنچایا۔ سنن ابوداؤد کا یہ نسخ مطبع قادری دہلی سے مولانا محمد بن بارک اللہ پنجابی کے حواشی اور اہتمام سے شعبان سنہ ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۶ء) میں شائع ہوا تھا۔ یہ نسخہ سنن ابوداؤد کے دنیا بھر کے مطبوعہ نسخوں میں صحت متن کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ علمائے عرب وعجم اس کی صحت وکمال کے مداح ومعترف ہیں، مثلاً مولانا شمس الحق ڈیانوی نے عون المعبود میں اس نسخہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے: ”وهو أصل صحيح لم يوجد له نظير“۔

اگرچہ اس نسخے کی طباعت حضرت مولانا احمد علی کے انتظام سے نہیں ہوئی مگر یہ طباعت بھی حضرت مولانا کا کارنامہ ہے اور ان کی توجہ محنت اور رہنمائی بلکہ مکمل علمی سرپرستی سے وجود میں آئی تھی۔

موطأ امام مالک بہ حاشیہ مولانا محمد مظہر کی اشاعت ۱۲۶۶

یہ حاشیہ اگرچہ حضرت مولانا کے قلم فیض رقم کا ثمر نہیں ہے مگر اس کی مقبولیت اور متواتر طباعت میں حضرت مولانا کی برکت اور مطبع کا اثر ضرور شامل ہے۔ موطا امام مالک کا یہ حاشیہ حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی نے لکھا تھا۔ حضرت مولانا کے مطبع احمدی دہلی سے سنہ ۱۲۶۶ھ میں پہلی مرتبہ شائع ہوا تھا۔ یہ موطا امام مالک کا وہی حاشیہ ہے جو عموماً تمام اہل درس اور طلبہ کے ہاتھوں میں رہتا ہے۔ ہند و پاکستان وغیرہ میں اس کی طباعت اور اس سے استفادہ حدیث شریف کے ہر ایک عالم و طالب علم کا گویا دائمی معمول ہے۔

حضرت مولانا کا آخری علمی کارنامہ قسطلانی شرح بخاری کی تصحیح و اشاعت

میری معلومات میں حضرت مولانا کا آخری علمی تصنیفی اشاعتی کارنامہ قسطلانی کی ارشاد الساری شرح بخاری کی تصحیح و طباعت ہے۔ یہ نسخہ حضرت مولانا کی ہدایت پر حضرت مولانا کے بڑے صاجزادے مولانا حبیب الرحمن بیدل سہارن پوری نے (جو غالب کے بھی ممتاز شاگردوں میں تھے) قلمی نسخوں کی مدد سے صحیح و مرتب کیا۔ یہ نسخہ پہلے مطبع نظامی کانپور سے، دوبارہ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے چھ جلدوں میں چھپا تھا۔ بہت عمدہ صاف ستھری طباعت ہے۔

الدلیل القوی علی ترک القراءۃ للمقتدی

متعدد متون حدیث کی تصحیح، تحقیق اور حواشی و طباعت کے علاوہ حضرت مولانا کی قرأت خلف الامام کے موضوع پر ایک تالیف بھی ہے، جس میں حضرت مولانا نے اس سلسلے کی احادیث نقل فرمائی ہیں اور قرأت خلف الامام کے دونوں پہلوؤں پر علمی فنی استدلالی گفتگو کی ہے۔ یہ رسالہ فارسی میں لکھا تھا، جو مطبع احمدی دہلی سے شعبان سنہ ۱۲۷۰ھ میں شائع ہوا۔ یہ رسالہ ستائیس صفحات پر مشتمل ہے۔

اردو ترجمہ الدلیل القوی ۱۲۹۵ھ

الدلیل القوی کی طباعت کے پچیس سال بعد، حضرت مولانا نے مولانا محمد بن مولانا عبد القادر لدھیانوی کی فرمائش پر اس کا خود ہی اردو ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ بھی اصل کتاب کے ہی نام سے، مطبع منشی رحمت اللہ لدھیانہ سے رجب سنہ ۱۲۹۵ھ میں چھپا تھا۔ یہ اشاعت یا ترجمہ پچاس صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جس سال اس ترجمہ کی اشاعت ہوئی، اس سال علامہ شبلی نعمانی حضرت مولانا کی خدمت میں حدیث پڑھنے کے لیے حاضر تھے۔ علامہ حضرت الاستاذ اور ان کے رسالے سے بہت متاثر تھے اور اس کی تائید و تقلید میں علامہ نے ''اسکات المعتدی'' تالیف کیا تھا۔

بعض الناس فی دفع الوسواس کی اشاعت

حضرت امام بخاری کا معمول ہے کہ وہ الجامع الصحیح میں فقہی کلامی مباحث میں قال بعض الناس کے مبہم اشارہ سے بعض معاصر اور قریب العہد فقہائے مجتہدین یا محدثین کے نظریات و مسائل کی تردید فرماتے ہیں، جس کی زد میں کئی موقعوں پر حضرت امام ابوحنیفہ بھی آئے ہیں، چوں کہ حدیث پڑھنے والوں کے لیے ہمیشہ یہ ایک بحث طلب مسئلہ اور سوال ہوتا ہے، اس لیے غالباً حضرت

مولانا احمد علی کی فرمائش پر ایسے تمام اعتراضات کا مدلل جواب لکھا گیا، جس کو مؤلف نے ''بعض الناس في دفع الوسواس'' کے نام سے موسوم کیا تھا۔ اس رسالے کو حضرت مولانا کے صاحب زادوں مولانا عبدالرحمن اور مولانا خلیل الرحمن صاحبان نے علاحدہ علاحدہ موقعوں پر شائع کیا، اس رسالے کے مؤلف کی تحقیق نہیں۔ ایک روایت یا خیال ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی یا مولانا خلیل احمد اسرائیلی علی گڑھی جو حضرت مولانا نانوتوی کے شاگرد بھی تھے، اس کے مؤلف ہیں۔ مگر دونوں روایتوں کی تصدیق مشکل ہے۔ بعض الناس کی اشاعت کے بعد اس کے کئی جواب لکھے گئے۔ علمائے احناف نے ان کے جواب الجواب بھی تحریر کیے ہیں۔

چند اور علمی خدمات

یہ حضرت مولانا کی صرف حدیث کے موضوع کی تصنیفی اشاعتی خدمات کا اجمالی تذکرہ ہے لیکن حضرت مولانا کے عمل کا دائرہ اور بھی متعدد موضوعات میں پھیلا ہوا تھا۔ حضرت مولانا نے تفسیر، فقہ، اصول، کلامیات وعقائد، تاریخ وادب وغیرہ موضوعات پر پچاسوں کتابوں کی تصحیح وحواشی کا اور اپنے معمول کے مطابق عمدہ طباعت کا اہتمام کیا۔ ایسی کتابوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ حضرت مولانا کے مطبع کی تقریباً چالیس کتابوں کا مجھے علم ہے۔ قرآن کریم کے نہایت عمدہ اور صحیح نسخے، جس میں ایک نسخہ اس وجہ سے قابل ذکر ہے کہ اس کی تصحیح میں حضرت شاہ ابوسعید مجددی، حضرت عبدالغنی، حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی، حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوری اور جامع مسجد دہلی کے امام مولانا سید احمد، نیز دہلی کے اعلیٰ درجہ کے قراء اور ماہرین شامل تھے۔ یہ قرآن مجید اس قدر صحیح تھا کہ اس میں ایک غلطی کی نشاندہی پر دو اشرفی کے انعام کا اعلان کیا گیا تھا۔ حضرت مولانا نے اس کے علاوہ بھی کئی مرتبہ قرآن مجید شائع کیا، ہر ایک اشاعت میں کوئی خصوصیت اور امتیاز ضرور رہے۔

تفاسیر میں تفسیر بیضاوی اور تفسیر جلالین کے نہایت عمدہ صحیح نسخے شائع کیے۔ تفسیر بیضاوی پر علماء کی ایک جماعت سے علاحدہ مفصل حاشیہ لکھوایا، جس میں شیخ احمد بن محمد یمانی اور مولانا فیض الحسن سہارن پوری جیسے صاحب فن صاحب نظر علماء بھی شامل تھے۔ تفسیر بیضاوی دو بڑی جلدوں میں سنہ ۱۲۹۸ھ میں چھپی تھی، اسی سال میں تفسیر جلالین بھی شائع کی، اس پر حاشیہ نہیں ہے۔

حضرت مولانا کی مرتب اور شائع کی ہوئی کتابوں میں فارسی کی بعض اہم مصنفات مثلاً تحفہ اثنا عشریہ حضرت عبدالعزیز، اخبار الاخیار شیخ عبدالحق، احوال ومقامات حضرت مرزا مظہر وغیرہ بھی شامل ہیں جو ان سب کتابوں کے آج تک سب سے بہتر اور صحیح ترین نسخے شمار کیے جاتے ہیں اور بھی متعدد کتابیں حضرت مولانا کے فیوض توجہ سے شائع ہوئیں یہاں ان کے تعارف کی ضرورت نہیں۔

یہ حضرت مولانا کی علمی تصنیفی خدمات کا ایک اجمالی سرسری جائزہ ہے۔ امید ہے کہ حضرات اہل علم ان معروضات پر اضافے فرما کر کاروانِ علم وتحقیق کو آگے بڑھائیں گے۔

...

یحییٰ دمشقی: اولین عیسائی سیرت نگار

پروفیسر عبدالرحیم قدوائی

قرآن کریم کی سورۃ المائدہ (آیات ۲۷ تا ۳۱) میں آدمؑ کے دو بیٹوں کا واقعہ مذکور ہے۔ ان کے نام کی صراحت کے بغیر یہ آیا ہے کہ بر بنائے حسد او ر ظلم قابیل اپنے بھائی ہابیل کے قتل کے جرم کا مرتکب ہوا۔ حدیث نبوی میں اس اولین قتل پر یہ بلیغ تبصرہ ہے:

لَا تُقْتَلُ نَفْسٌ ظُلْمًا إِلَّا كَانَ عَلَى ابْنِ آدَمَ الْأَوَّلِ كِفْلٌ مِنْ دَمِهَا وَ ذَلِكَ لِأَنَّهُ أَوَّلُ مَنْ سَنَّ الْقَتْلَ.(صحیح البخاری، کتاب أحادیث الأنبیاء، رقم الحدیث:3335)۔

ترجمہ: ''جو قتل بھی بر بنائے ظلم ہوتا ہے، اس کے خون ناحق کا گناہ آدم کے اس پہلے بیٹے پر بھی ہوتا ہے کیوں کہ اس شخص نے پہلا قتل کیا۔''

> ۷۰۶ء میں یحییٰ دمشقی اموی دربار سے معزول یا سبک دوش ہوئے اور یروشلم کے نزد St.Sabas خانقاہ میں اسلام مخالف تصنیف اور تالیف میں مشغول ہو گئے۔ ان کی تصنیف de haeresibus کا موضوع زندقہ بنی اسماعیل ہے۔ دوسری تصنیف Dialexis ایک عیسائی اور بنی اسماعیل کے ایک فرد کے مابین بہ ظاہر مکالمے لیکن اصلاً مناظرے پر مشتمل ہے۔ اس مناظرے میں فاتح عیسائی اور مقہور اور معتوب فرد بنی اسماعیل کا نمائندہ ہے، جو عقل، دلیل اور حق سے مطلق عاری ہے۔ عیسائیت کے لیے نور اور اسلام کے لیے ظلمت کے استعارے مغربی بیانیے میں عام ہیں۔

عیسائی عالم دین یحییٰ دمشقی John of Damascus (۶۷۵ء-۷۴۹ء) سیرت طیبہ کی کردارکشی کی قابل نفریں روایت کے قابیل ہیں کہ اسلام، قرآن کریم، سیرت طیبہ کو اپنی تصانیف de haeresibus اور Dialexis میں مسخ کرنے کے فعل قبیحہ کی رسوائی ان کے اعمال نامے کے ساتھ مخصوص ہے۔ ساتویں صدی سے آج اکیسویں صدی تک سیرۃ طیبہ پر بالخصوص مغرب میں نام نہاد علمی سرگرمی اور تحقیق کے بہ ظاہر مقدس اور مرعوب کن نام پر جو سب وشتم کا بازار گرم ہے، اس کا اصل ماخذ یحییٰ دمشقی ہی کی مذکورہ بالا تصانیف ہیں۔ موصوف کا عہد وفات رسول اکرمؐ سے متصل صحابہ کرام اور تابعین عظام کا ہے۔ یعنی ساتویں صدی عیسوی کا آخر اور آٹھویں صدی عیسوی کا نصف اول۔ دمشق ان کے دادا منصور کے زمانے میں اسلام کے زیرنگیں ہو چکا تھا۔ خود یحییٰ دمشقی اموی خلفا عبدالملک، الولید اور عمر ثانی کے نمک خوار اور محکمہ محصولات میں اعلی منصب پر فائز تھے۔ مسلمانوں سے براہ راست ملاقات، مکالمے، معاملات اور استفسار کے دروازے ان کے لیے وا تھے۔ لیکن جب قلب و ذہن خباثت اور شقاوت کی آماج گاہ ہوں تو حق

سے یکسر بے رخی بل کہ اس کی تلبیس کچھ ایسا عجب نہیں! ابلیس بھی راندۂ درگاہ ہونے سے قبل بہ ہر کیف ایک برگزیدہ جن تھا۔اس کا بہ ظاہر تقشف اور قرب الٰہی اس کے اپنے پروردگار اور رب العلمین کی صریحاً حکم عدولی بل کہ دیدہ و دانستہ بغاوت اور سرکشی میں ہرگز دافع اور نافع ثابت نہیں ہوا بل کہ اس نے عمداً ترجیح حکم الٰہی کی خلاف ورزی کو دی۔

یحییٰ دمشقی اس لحاظ سے ابلیس اور قابیل کے مثیل ہیں کہ قرب حق کے باوصف انھوں نے قبیح اور شنیع ہی راہ کا انتخاب کیا اور صدیوں تک اپنے لاکھوں، کروڑوں منتسبین کو اسلام، قرآن کریم، سیرۂ طیبہ کے خلاف ایسا متنفر اور منغض کیا کہ ان کے دل و دماغ میں اسلام کے لیے کوئی رغبت، کشش یا کوئی مثبت خیال تک نہ آپائے اور وہ اسے محض شر مجسم سمجھیں۔ساتویں صدی کے ارباب کلیسا نے ان کو بہ ظاہر محرم راز اندرون خانہ کے طور پر معتبر گردانا اور ان کے ہفوات کو سند کا درجہ دیا اور جو باطل تصورات انھوں نے پیش کیے، وہی آج تک عیسائی، اہل مغرب، بالخصوص مستشرقین (مغربی فضلائے اسلام) کے قلب پر من وعن نقش کالحجر ہیں اور ہر دور میں وہ یحییٰ دمشقی کی فکری کجی اور گمراہی پر اپنے اپنے فتنہ پرور اضافے کرتے رہے ہیں۔البتہ اس باب میں بنیادگزاری کی بدنامی بلاشریک وسہیم موصوف ہی کا اکتساب ہے۔ایسی شرانگیز سیادت کا شرف شاذ ہی کسی کے حصے میں آتا ہے:

یہ منصب بلند ملا جس کو مل گیا

موصوف کے سامان رسوائی کی بعض اذیت ناک تفصیلات اکراہ کے ساتھ بہ طور مثال پیش ہیں:

۷۰۶ء میں یحییٰ دمشقی اموی دربار سے معزول یا سبک دوش ہوئے اور یروشلم کے نزد St.Sabas خانقاہ میں اسلام مخالف تصنیف اور تالیف میں مشغول ہو گئے۔ان کی تصنیف de haeresibus کا موضوع زندقہ بنی اسماعیل ہے۔دوسری تصنیف Dialexis ایک عیسائی اور بنی اسماعیل کے ایک فرد کے مابین بہ ظاہر مکالمے لیکن اصلاً مناظرے پر مشتمل ہے۔اس مناظرے میں فاتح عیسائی اور مقہور اور معتوب فرد بنی اسماعیل کا نمائندہ ہے، جو عقل، دلیل اور حق سے مطلق عاری ہے۔عیسائیت کے لیے نور اور اسلام کے لیے ظلمت کے استعارے مغربی بیانیے میں عام ہیں۔

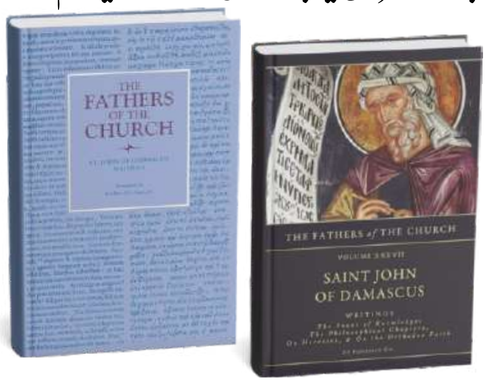

اس مقام پر یہ وضاحت لازم ہے کہ یحییٰ دمشقی کی طرح ہر یہودی اور عیسائی کو بائبل کے زیر اثر اسماعیلؑ اور ان کی ذریت سے بغض للّٰہی تھا کہ بائبل میں اسماعیلؑ کا ذکر انتہائی مختصر اور تبعاً اور ضمناً ہے اور وہ بھی اس شرم ناک تحقیر آمیز پیرائے میں کہ "وہ ایک کنیز زادہ ہے، جنگلی گدھے کی مانند جنگجو، ہر ایک کے خلاف شمشیر برہنہ برسرپیکار رہتا ہے نتیجۃً دوسری اقوام بھی اس پر حملہ آور ہوتی ہیں"۔(بائبل، کتاب پیدائش، باب ۱۶ آیات ۱۰ تا ۱۲)۔بنی اسماعیل کے خلاف یہود اور عیسائیوں کی صدیوں قدیم مخاصمت کا منبع ان کا مذہبی صحیفہ بائبل ہے اور اس کے ہول ناک مظاہر اور مناظر ایک ارض فلسطین پر کیا موقوف پورے عالم عرب میں روزمرہ کا

معمول ہیں۔عراق اور شام کی تاراجی کے ہم سب ہی بے بس شاہد ہیں۔مغرب کے ہاتھوں ممالک عرب کی نو آبادیاتی غلامی کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔(۱)

یحییٰ دمشقی نے بنی اسماعیل کے لیے ہتک آمیز لقب Agarenes (کنیز ہاجرہ کی آل اولاد) کا استعمال کیا ہے۔بین السطور ابراہیم سے ان کی گویا لاتعلقی ،مجہول کنیز زادے جن کا مذہب، ثقافت اور نسل ناقابل التفات ہے اور ان کا واحد مصرف صرف اشرف اور انجب بنی اسرائیل کی غلامی ہے۔نسل پرستی کا یہ عفریت بائبل کا عطیہ ہے، جو بالواسطہ طور پر اس کے محرف ہونے کی اندرونی شہادت بھی ہے۔اسی نسلی تفاخر سے مخمور یحییٰ دمشقی کو مسلمانوں یا عرب تک کا نام لینا بھی گوارا نہیں۔وہ تشخص سے عاری مستقلاً کنیز زادے کے طور پر مذکور ہیں۔نسلی عصبیت اور تفاخر کی کیسی کریہہ مثال۔

یحییٰ دمشقی نے اسلام، قرآن کریم، سیرۃ طیبہ کے خلاف معاندانہ بل کہ صریحاً مناظرانہ اور سب وشتم کی روایت کی بنیاد رکھی۔گزشتہ کئی صدیوں میں اس نے استشراق (Orientalism) اور ہمارے دور میں اسلام کے خلاف نفرت (Islamophobia) کی شکل اختیار کی ہے۔یحییٰ نے رسول اکرم ﷺ کے خلاف یہ زہرافشانی کی ہے:''ان کا دعوی نبوت صریح کذب ہے۔بائبل کے

> کلیسا اور مغربی فضلا کے لیے یحییٰ دمشقی کی تصانیف اساسی اہمیت کی حامل ہیں۔سیرۃ طیبہ پر بعد کے ادوار کے مستشرقین کی تصانیف نظریاتی لحاظ سے بڑی حد تک اسی پر مبنی ہیں کہ وہ یحییٰ کو انتہائی معتبر ماخذ گردانتے ہیں۔

مطالعے اور چوتھی صدی عیسوی کے اسکندریہ کے زندیق عیسائی آریوس (Arian) کے پیرو بحیرہ راہب کے زیر اثر انھوں نے ایک نئے زندقے یعنی اسلام کا باب وا کیا''۔[جوش مخالفت میں یحییٰ کو یہ ہوش بھی نہیں رہا کہ رسول اکرم ﷺ خواندہ نہیں، اُمّی تھے۔مزید برآں، عالم عرب میں بائبل کا عربی ترجمہ آٹھویں صدی سے قبل منظر عام پر آیا ہی نہیں تھا۔جہاں تک بحیرہ راہب کی اتالیقی کا بہتان ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ شام کے ایک تجارتی سفر میں رسول اکرم ﷺ اپنے شفیق چچا ابو طالب کے ہم راہ تھے اور آپ ﷺ کی عمر اس وقت صرف بارہ سال تھی اور سرراہ بحیرہ نے اس نوعمر لڑکے میں آثار نبوت شناخت کرتے ہوئے آپ ﷺ کے چچا کو مطلع کیا تھا۔کیا کوئی شخص بہ حالت ہوش وحواس اس واہمے کو لائق اعتنا بھی سمجھ سکتا ہے کہ ایک غیر زبان کا نمائندہ محض بارہ سالہ لڑکا چند لمحوں میں ایک اجنبی شخص سے ایسے اسرار اور رموز کے حصول پر قادر ہو گیا کہ اسی کی بنیاد پر ۲۸ سال بعد اس نے ایک مکمل جامع نیا مذہب، ایک منفرد اور بے مثل مصحف ، ایک مبسوط آئین عقائد، احکام اور آداب اور ایک نیا طریقۂ عبادت مع مفصل مناسک وضع کر لیے؟ یحییٰ مزید رقم طراز ہیں:

''ان کی تصنیف مضحکہ خیز ہے۔البتہ انھوں نے اپنے متبعین کو اس کی تعظیم اور تکریم پر مجبور کیا۔توحید، عیسی اور مریم سے متعلق ان

کے بیانات طفلانہ ہیں۔انھوں نے حالت نوم میں وحی الٰہی سے سرفراز ہونے کا ناقابل یقین دعوی کیا۔وہ خدا کی ذات کو منقسم اور مجروح کرنے کے مجرم ہیں کہ انھوں نے عیسی کو کلمۃ اللہ اور روح اللہ تسلیم کرنے کے باوصف عیسی کو خدا سے جدا ایک ممیز شخصیت متصور کیا جب کہ بہ طور کلمہ اور روح وہ خدا کا جزو لاینفک ہیں۔توحید کے بلند و بانگ دعوی کے باوجود وہ اور ان کے پیرو بدترین مشرک ہیں۔وہ کعبہ، مکہ میں حجر اسود کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔یہ پتھر ان کے لیے باعث متبرک ہے کہ اسی پتھر پر ابراہیم نے ہاجرہ کے ساتھ جنسی فعل انجام دیا تھا اور جب ابراہیم اسحٰق کو قربان کرنے کے لیے آئے تو اسی پتھر سے انھوں نے اپنا اونٹ باندھا تھا۔اسی طرح اس زندقے کے شکار افراد Aphrodite (زہرہ نامی دیوی) کے پرستار ہیں اور اپنی زبان میں اسے ''اکبر'' سے موسوم کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ''اکبر'' کی اصطلاح ان کے مراسم عبادات میں نمایاں طور پر مستعمل ہے''۔ [حیرت اور عبرت کا مقام ہے کہ سلطنت امیہ کا عربی داں عہدے دار ''اکبر'' جیسے سادہ عربی لفظ کے بارے میں یہ معنی آفرینی کرے!] وہ سراپا فریب اور جنس زدہ انسان تھے۔انھوں نے مردوں اور عورتوں کے ختنے کا حکم دیا۔یوم سبت کے تقدس کا انکار کیا۔بپتسمہ کی رسم کو ختم کیا۔شریعت موسوی میں مذکور حرام اشیا کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیا اور شراب کو ممنوع کیا''۔

رسول اکرم ﷺ کے خلاف اس فرد جرم کی بنیاد پر یحییٰ کی دانست میں اسلام ایک بدترین زندقہ اور بائبل کا قابل نفریں چربہ ہے۔یہ محض اتفاق نہیں کہ عیسائی مذہب میں پروٹسٹنٹ (Protestant) فرقے کے بانی مارٹن لوتھر (Martin Luther) (م ۱۵۴۶ء) نے یحییٰ کے آٹھ سو سال بعد اسلام، سیرۃ طیبہ کے خلاف ان ہی الزامات کو عائد کیا۔یحییٰ کی نظر میں ''عیسی کی بے وقعتی اور بے توقیری محمد ﷺ کا ناقابل معافی جرم ہے۔چوں کہ وہ شر مجسم تھے، انھوں نے عیسائی عقائد کو اپنا ہدف بنایا۔اسلام ایک سرتاسر شیطانی زندقہ ہے، جس کی مکمل بیخ کنی لازم ہے''۔[یہ اضافہ غالباً غیر ضروری ہے کہ مغرب آج تک یحییٰ دمشقی کے اس فتوی پر انتہائی اہتمام اور راسخ العقیدگی سے کاربند ہے]۔

تعصب میں گرفتار انسان کیسا اندھا اور فاتر العقل ہو جاتا ہے، اس کا مظہر یحیی کے شاگرد Adam Francisco کے یہ شرمناک بیانات ہیں، جو ''نقل کفر کفر نہ باشد'' کے تحت درج ہیں:

''یہ جعلی، فریبی پیغمبر شیطان کا فرزند اکبر ہے۔جلد ہی وہ اور اس کے پیرو غضب الٰہی کا شکار ہوں گے''۔

یحییٰ کو اسلام قرآن کریم/سیرۃ طیبہ میں خیر کا کوئی پہلو مطلق نظر نہیں آیا۔ان کے مطابق صرف عیسائیت حق ہے اور وہ اس کے ماسوا کسی اور عقیدے کا ذکر تک سننے کے روادار نہیں۔اسلام کے خلاف ان کے بغض اور عناد کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ ان کے دور میں خود ان کے شہر اور اس کے اطراف اور اکناف میں بکثرت عیسائی برضا و رغبت مشرف بہ اسلام ہو رہے تھے۔وہ عیسائیت کے تثلیث اور دیگر چیستاں عقائد سے دلبرداشتہ ہو کر اسلام جیسے فطری مذہب کی آغوش میں قلبی اور روحانی تسکین اور مسرت پا رہے تھے۔ان کو متنبہ کرنے کے لیے یحییٰ نے اسلام کو عیسائیت کی ایک منحرف اور مسخ شکل سے تعبیر کیا۔ان کے مطابق یہ زندقہ عیسائیت پر شب خون مارنے کے مرادف ہے، جو ان کو راہ نجات سے گمراہ کر دے گا۔

یحییٰ کا سیرۃ طیبہ پر ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ توریت بنی اسرائیل کی نظروں کے سامنے نازل ہوا کرتی تھی اور وہ اس کے چشم دیدگواہ تھے۔ اس کے برعکس نزول وحی رسول اکرم ﷺ کا اپنا ذاتی تجربہ تھا، جس میں نہ کوئی شریک تھا اور نہ اس کا کوئی شاہد ہوتا تھا۔ یحییٰ کی منطق کی رو سے جب نکاح اور تجارتی معاہدے جیسے معاملات کے لیے گواہ کی شرط لازم ہے، وحی الٰہی کے نزول جیسے مہتم بالشان امر کے لیے چشم دیدگواہ ناگزیر ہیں اور ان کے بغیر وحی کا نزول مشتبہ نہیں بل کہ ایک افسانہ ہے اور اس پر مبنی مذہب فرضی اور جعلی ہے۔ یحییٰ کا دوسرا اعتراض اسلام میں مرد کے لیے تعدد ازدواج کی اجازت اور عورت کے لیے اس کی ممانعت پر ہے۔ انھوں نے رسول اکرم ﷺ کے زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح پر بھی رکیک حملے کیے ہیں اور اس رشتے کو ناپاک قرار دیا ہے کہ ان کی دانست میں یہ اپنی بہو سے نکاح کا حیاسوز معاملہ ہے۔

یحییٰ مجسمہ پرستی کے غالی حامی تھے۔ ان ہی کی تشویق اور تحریک پر ۷۸۷ء میں نیسا (Nicea) میں منعقد ارباب کلیسا کی مجلس شوریٰ (Council) نے مجسمہ پرستی کو عیسائی عقیدے کا جزو تسلیم کیا۔ لہٰذا یہ امر چنداں حیرت انگیز نہیں کہ اسلام میں توحید پر اصرار، شرک سے نفور اور بت شکنی کے احکام ان پر سخت گراں گزرے اور اس باعث بھی انھوں نے اسلام کو یکسر مسترد کیا۔ کلیسا اور مغربی فضلا کے لیے یحییٰ دمشقی کی تصانیف اساسی اہمیت کی حامل ہیں۔ سیرۃ طیبہ پر بعد کے ادوار کے مستشرقین کی تصانیف نظریاتی لحاظ سے بڑی حد تک اسی پر مبنی ہیں کہ وہ یحییٰ کو انتہائی معتبر ماخذ گردانتے ہیں۔ وہ ان کے دمشق میں مقیم ہونے، اموی دربار سے وابستہ ہونے اور اسلام اور مسلمانوں سے براہ راست ربط ضبط کے پیش نظر ان کے فرمودات کو قول فیصل کا درجہ دیتے ہیں۔ البتہ دجل و فریب اور صریحاً کذب بیانی کے ظلم عظیم کے باعث درحقیقت یحییٰ کا شمار ابلیس اور قابیل کے زمرے میں ہوتا ہے اور یہ امر ان کے لیے دائمی ننگ و عار کا باعث ہے کہ ان کے تعصبات اور مزعومات کی بہ دولت مغرب اسلام سے متنفر ہوا جو کہ عالم اسلام پر مہلک مغربی یلغار پر منتج ہوا۔ ان تمام مصائب کا وبال یحییٰ دمشقی کے مسموم ذہن اور اس کی زائیدہ گمراہ کن تصانیف کے سر ہے۔ یہ اولین عیسائی سیرت نگار کسی لحاظ سے بھی قابل تقلید نہیں۔

حاشیہ

ا۔ بائبل میں اسمٰعیل علیہ السلام کی کردارکشی کے بارے میں دیکھیں: عبدالرحیم قدوائی: "اسمٰعیل علیہ السلام کی شخصیت: بائبل اور قرآن میں موازنہ اور تجزیہ" - مجلہ تحقیقات اسلامی، علی گڑھ میں زیر اشاعت۔

منتخب کتابیات

1.Himmerich, M.F. Deification in John of Damascus,Marquette University, 1985.

2.Janosik, D.J,.John of Damascus:First Apologist to the Muslims. Wipf and Stock, 2016.

3.Koval, B Analysis and evaluation of the arguments of John of Damascus.Adventist International Institute of Advanced Studies, 2019.

4.Louth, A. St. John Damascene. Brill, 1998.

5.Sahas, Dr. John of Damascus on Islam Revisited. Abr Nahrain 23 (1984) 104-118.

6.Zaid Hussain,"John of Damascus″,Global Mass Communication Review 6 4 (12-21)

مستشرقین کا تیار کردہ اشاریہ حدیث

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

ضخیم کتابوں میں مطلوبہ مواد تک کم وقت میں اور آسانی کے ساتھ رسائی کے لیے فہرست سازی اور اشاریہ نگاری کے فنون وجود میں آئے۔ اشاریہ نگاری کو جدید ترین فن سمجھا جاتا ہے، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کا ایجاد کردہ ہے۔ انھوں نے مختلف علوم میں ایسی کتابیں صدیوں پہلے تیار کی تھیں جن کی مدد سے مطلوبہ مواد تک پہنچنے میں سہولت ہو۔ علمِ حدیث میں یہ کام کئی پہلوؤں سے ہوا ہے۔ مسانید میں ہر صحابی کی روایات کو یکجا کیا گیا۔ ایسی کتابیں تالیف کی گئیں جن میں اطراف حدیث (احادیث کے ابتدائی ٹکڑوں) کو حروف تہجی کی ترتیب پر جمع کیا گیا تھا۔ ایسی کتابوں میں ابو مسعود دمشقیؒ (م ۴۰۱ھ) کی 'أطراف الصحیحین'، ابو العباس احمد بن ثابت اصفہانیؒ (م ما بعد ۵۲۱ھ) کی 'أطراف الکتب الخمسة'، ابن عساکر (م ۵۷۱ھ) کی 'الاشراف بمعرفة

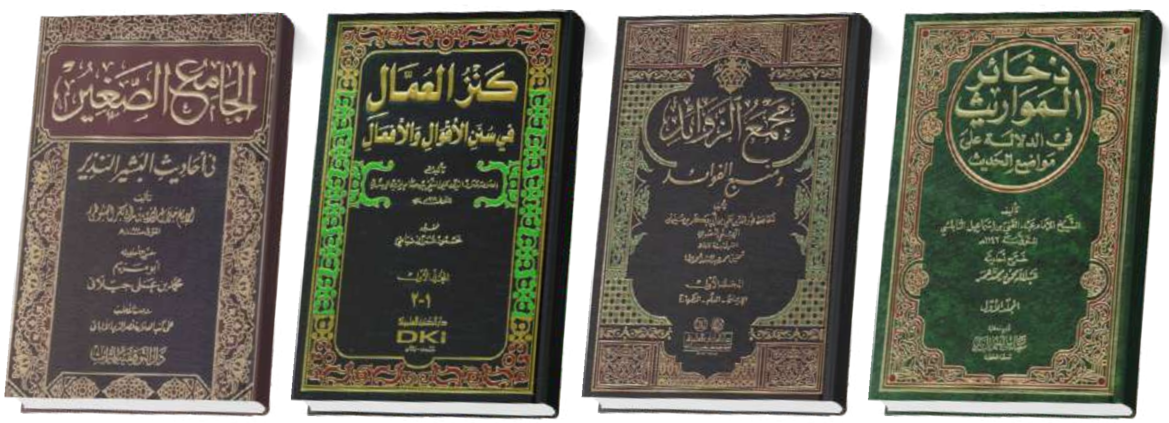

الأطراف'، مزیؒ (م ۷۴۲ھ) کی 'تحفة الاشراف بمعرفة الأطراف'، نابلسیؒ (م ۱۱۴۳ھ) کی 'ذخائر المواریث فی الدلالة علی مواضع الأحادیث' قابل ذکر ہیں۔ کچھ کتابوں کی تالیف معجم کے طور پر کی گئی کہ ان میں احادیث کے ابتدائی الفاظ کو حروف تہجی کی ترتیب پر جمع کیا گیا۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) کی 'الجامع الکبیر، الجامع الصغیر اور زوائد الجامع الصغیر اسی طرز کی کتابیں ہیں۔ کچھ کتابیں موضوعاتی اعتبار سے تیار کی گئی ہیں کہ ان میں کسی ایک یا دو کتابوں کو منتخب کرکے اور کچھ موضوعات متعین کرکے انھیں از سر نو مرتب کیا گیا ہے۔ مثلاً حمیدی الأندلسی (م ۴۸۸ھ) کی 'الجمع بین الصحیحین'، رزین السرقسطیؒ (م ۵۳۵ھ) کی 'التجرید للصحاح السنة'، ابن الاثیرؒ (م ۶۰۶ھ) کی 'جامع الأصول من أحادیث الرسول'، نور الدین ہیثمیؒ (م ۸۰۷ھ) کی 'مجمع الزوائد و منبع الفوائد، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (م ۸۵۲ھ) کی

المطالب العالية بزوائد المسانيد الثمانية، علی متقی ہندیؒ (م ۹۷۵ھ) کی '**کنز العمال من سنن الاقوال والافعال**' اور احمد بن عبدالرحمن البناءؒ (م ۱۳۷۸ھ) کی '**الفتح الربّانی فی ترتیب مسند الامام أحمد بن حنبل الشيبانی**' اور '**منحة المعبود فی ترتیب مسند الطيالسی أبی داؤد**' وغیرہ۔ ایک طریقہ یہ بھی اختیار کیا گیا کہ کسی متعین کتابِ حدیث کو لے کر اس میں

المعجم المفهرس لألفاظ الحديث النبوی کو مشہور مستشرق پروفیسر اے۔ جے۔ ونسنک (۱۸۸۸ء۔ ۱۹۳۹ء) Arent Jan Wensink اور ان کے رفقاء نے مرتب کیا ہے۔ اس میں صحاح ستہ کے علاوہ موطا امام مالک، مسند احمد اور سنن الدارمی کے الفاظِ احادیث کی اشاریہ سازی کی گئی ہے۔ ان نو (۹) کتب حدیث میں موجود کوئی حدیث تلاش کرنی ہو، یا یہ جاننا ہو کہ فلاح حدیث ان میں سے کس کس کتاب میں آئی ہے؟ تو اس کتاب کی مدد سے اسے بہ آسانی تلاش کیا جاسکتا ہے۔

کچھ الفاظ کو اکٹھا کر کے انھیں لغت کے انداز میں حروف تہجی کی ترتیب پر مرتب کیا گیا ہے، پھر وہ الفاظ جن احادیث میں آئے ہیں ان کا اندراج کیا گیا۔ اس سلسلے میں شیخ مصطفی بن علی بن محمد البیومی (م مابعد ۱۳۵۲ھ) کا نام لیا جاتا ہے، جنھوں نے اس طرز پر کتبِ ستہ کی اہم کتابوں کی اشاریہ سازی کی تھی۔ مؤخر الذکر طرز پر مستشرقین کے تیار کردہ اشاریہ حدیث **المعجم المفهرس لألفاظ الحديث النبوی** کو غیر معمولی شہرت ملی ہے۔ اس مقالے میں اسی کا تعارف مقصود ہے۔

المعجم المفهرس لألفاظ الحديث النبوی کو مشہور مستشرق پروفیسر اے۔ جے۔ ونسنک (۱۸۸۸ء۔ ۱۹۳۹ء) Arent Jan Wensink اور ان کے رفقاء نے مرتب کیا ہے۔ اس میں صحاح ستہ کے علاوہ موطا امام مالک، مسند احمد اور سنن الدارمی کے الفاظِ احادیث کی اشاریہ سازی کی گئی ہے۔ ان نو کتب حدیث میں موجود کوئی حدیث تلاش کرنی ہو، یا یہ جاننا ہو کہ فلاں حدیث ان میں سے کس کس کتاب میں آئی ہے؟ تو اس کتاب کی مدد سے اسے بہ آسانی تلاش کیا جاسکتا ہے۔

اس کتاب کی ترتیب و تالیف کا عرصہ تقریباً پینسٹھ برسوں (۱۹۲۲ تا ۱۹۸۷ء) پر محیط ہے اور تقریباً اتنی ہی تعداد ان دانش وروں اور محققین کی ہے جنھوں نے اس پروجیکٹ میں اپنا علمی تعاون پیش کیا ہے۔ اس طرح یہ اہم علمی کام چار نسلوں کی کاوشوں کا حاصل ہے۔ مغرب میں اجتماعی تحقیق کا جو رواج چل پڑا ہے۔ یہ کتاب اس کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

ونسنک۔ مختصر تعارف

اے۔ جے۔ ونسنک ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۷ء تک لیدن یونی ورسٹی (University Of Leiden) میں عبرانی زبان کے استاد رہے۔ سامی زبانوں کی معرفت میں انھیں کافی شہرت ملی۔ ۱۹۲۷ء سے وہ اسی یونی ورسٹی میں عربی زبان کے پروفیسر ہو گئے۔ اس منصب پر ان سے پہلے مشہور مستشرق کرسٹان سنوک ہرخرونجہ (۱۸۵۷ء۔ ۱۹۳۶ء) Christian Snouck Hurgronje فائز تھے۔

ونسنک نے اسلامیات پر مطالعہ وتحقیق کو اپنا خاص موضوع بنایا۔ ان کا پی ایچ ڈی مقالہ 'محمد اور یہود مدینہ' (طبع لیدن ۱۹۰۶ء)

کے عنوان سے تھا۔ ۱۹۲۵ء میں انھوں نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی تدوین میں حصہ لیا اور اس کی چار (۴) جلدیں تیار کیں۔

ان کی چند تصانیف یہ ہیں:

مشرقی (عیسائی اور اسلامی) تصوف (طبع لیدن ۱۹۲۸ء)

اہلِ مشرق کے نزدیک مشئیۃ واحدہ کا اعتقاد (طبع لیدن ۱۹۲۸ء)

سریانی ادبیات میں مشرقی تصوف (طبع لیدن ۱۹۲۸ء)

عقیدۂ اسلامی اور اس کا تاریخی ارتقاء (طبع کیمبرج ۱۹۳۲ء)

غزالی کا فکر (طبع پیرس ۱۹۴۰ء)

ونسنک کو حدیث پر بھی علمی کام کرنے سے دل چسپی تھی۔ اس موضوع پر ان کی ایک اہم کتاب Handbook of Early Muhammadan Tradition (طبع لیدن ۱۹۲۷ء) ہے۔ یہ حدیث نبوی کی چودہ (۱۴) بنیادی کتابوں میں موضوعات حدیث کا اشاریہ ہے۔ حدیث پر ان کی دوسری اہم کتاب 'المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی' ہے، جس کا اس مقالے میں تعارف کرایا جا رہا ہے۔

معجم کی تالیف کا ابتدائی تصور

پروفیسر ونسنک کے ذہن میں معجم کی تالیف کا خیال ۱۹۱۶ء سے قبل آیا تھا۔ اس سلسلے میں انھیں مستشرق ہرخرونجہ Hurgronje سے رہ نمائی ملی تھی۔ البتہ انھوں نے اس پروجیکٹ پر باقاعدہ کام ۱۹۲۲ء سے شروع کیا ہے۔

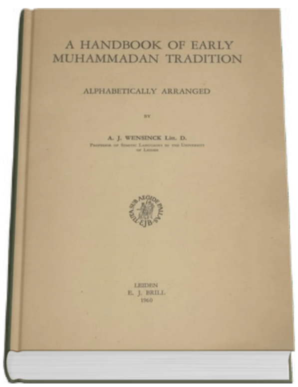

۱۹۲۷ء میں ونسنک نے اپنی کتاب Handbook of Early Muhammadan Tradition شائع کی۔ اس کتاب میں متون حدیث پیش کرنے کے بجائے صرف موضوعات کا تذکرہ Alphabet کی ترتیب سے کیا گیا تھا اور ان مقامات کے حوالے دیے گئے تھے جہاں کتب حدیث میں ان پر مواد مل سکتا تھا۔ اس کی تالیف کے لیے جو مواد اکٹھا کیا گیا وہی بعد میں معجم کی تالیف میں کام آیا۔ لیکن دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ہینڈ بُک کے برخلاف معجم کے بارے میں یہ منصوبہ بنایا گیا کہ اس کی زبان عربی ہوگی اور اس میں بنیادی کلمات کو ان کے سیاق کے ساتھ ذکر کیا جائے گا۔

معجم کی تالیف کا مقصد ونسنک اور ان کے معاونین کے نزدیک یہ نہیں تھا کہ اسے لغوی مطالعات کے لیے ایک مرجع کی حیثیت دے دی جائے، بلکہ اسے ایک ایسا ماخذ بنانا ان کے پیشِ نظر تھا جس کے ذریعہ اہلِ علم کو احادیثِ نبوی کی اہم کتابوں میں مطلوبہ احادیث تلاش کرنے میں آسانی ہو۔

انداز تالیف

ونسنک اور ان کے معاونین نے معجم کی تالیف کا خاکہ اس طرح بنایا کہ وہ الفاظ جن کا کتب حدیث میں بہت زیادہ استعمال

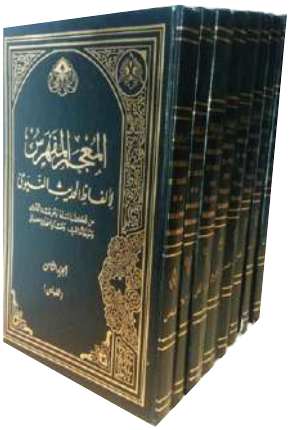

ہوا ہے اور ان سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوتا انھیں حذف کر دیا جائے۔ اور وہ الفاظ جن کا کثرت سے استعمال ہوا ہے اور وہ مفید مطلب بھی ہیں، انھیں بغیر سیاق سے ذکر کر دیا جائے۔ اس سے علمی اور اقتصادی دونوں اعتبار سے فائدہ ہوگا۔ اس لیے کہ اگر کوئی ایک لفظ یا جملہ بھی ساقط نہیں کیا جائے گا تو کتاب کا حجم بہت زیادہ بڑھ جائے گا، اس کی وجہ سے اس سے استفادہ میں بہت دشواری ہوگی اور طباعت کے اخراجات بھی بہت بڑھ جائیں گے۔ چنانچہ اسی نہج پر وہ کام کرنے لگے۔

ونسنک کے اس کام کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ بعض لوگوں نے یہ رائے دی کہ وہ جن کتب حدیث کا اشاریہ تیار کرنا چاہتے ہیں، پہلے انہی کے محقق ایڈیشن شائع کریں۔ اس کے جواب میں ونسنک کا کہنا تھا کہ اس قسم کے کام کے لیے ان کی عمر ناکافی ہے۔ انھوں نے نصوص کو اسی طرح نقل کیا جس طرح وہ دست یاب کتابوں میں درج تھے۔ گویا انھیں یہ بات تسلیم تھی کہ جن نصوص کی تحقیق علمی طور پر نہیں ہوسکی ہے ان میں غلطیوں کا در آنا ممکن ہے۔ چنانچہ ونسنک اور ان کے بعد کام کرنے والوں نے بھی اسی انداز پر کتب حدیث کی دست یاب غیر محقّق طباعتوں (Editions) پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا۔

بعد میں مصری محقق و دانش ور محمد فواد عبد الباقی نے صحیح مسلم، سنن ابن ماجہ اور مؤطا امام مالک کے محقق ایڈیشن شائع کیے تو انھوں نے احادیث پر نمبر ڈالنے میں ان نمبروں کی رعایت کی جو ونسنک نے اپنی معجم میں درج کیے تھے۔

اشاعت کا آغاز

ڈاکٹر جے۔ جے وِٹکام (J.J.Witkam) نے لکھا ہے:

"۱۹۳۶ء المعجم المفهرس کی تالیف کی تاریخ کا سب سے اہم مرحلہ تھا۔ اس مرحلہ میں کتب حدیث کا دقّت و باریکی سے مطالعہ کر کے نصوص (الفاظ مع سیاق) کے کارڈس تیار کر لیے گئے۔ اس طرح بنیادی کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اس کے بعد اس خام مواد کی روشنی میں اصل کتاب کی تالیف کا باقاعدہ آغاز کیا گیا۔"

الاتحاد الأممي للمجامع العلمية
المعجم المفهرس
لألفاظ الحديث النبوي
عن الكتب الستة وعن مسند الدارمي
وموطأ مالك ومسند أحمد بن حنبل
رتّبه ونظّمه لفيف من المستشرقين
ونشره
الدكتور أ. ي. ونسنك
أستاذ العربية بجامعة ليدن
مكتبة بريل في مدينة ليدن سنة
١٩٣٦

لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی، بلکہ شواہد ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتب شکل میں تالیف کا آغاز چوتھی دہائی کے اوائل ہی سے ہوگیا تھا۔ معجم کی طباعت و اشاعت کا کام پہلے اجزاء کی شکل میں کیا گیا۔ ہر جزء اسّی صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ (اسے فصل Lirvaison کا نام دیا گیا)۔ سات فصول کی اشاعت کے بعد انھیں ایک جلد کی شکل دے دی جاتی تھی۔ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ کی لائبریری میں معجم کا جو قدیم نسخہ ہے، خوش قسمتی سے اس کی جلد اول میں فصل سوم کا سرورق موجود ہے۔ اس پر سنۂ اشاعت ۱۹۳۴ء درج ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ فصل اول کی اشاعت اس سے بھی پہلے ہو چکی ہے۔

جلد اول (ا-ح)

سات فصول پر مشتمل جلد اول ۱۹۳۶ء میں پروفیسر ونسنک کی نگرانی میں شائع ہوئی۔اس کے سرورق پر مرتبین کا تذکرہ یوں کیا گیا ہے:

”رتّبه و نظّمه لفیف من المستشرقین، و نشره الدکتور أ۔ی۔ونسنک أستاذ العربیة بجامعة لیدن۔“

مقدمہ میں ونسنک نے ذکر کیا تھا کہ وہ کتاب کی آخری جلد میں اس پروجیکٹ کی تفصیلات بیان کریں گے اور اس کے آغاز و ارتقاء کے مراحل پر روشنی ڈالیں گے۔لیکن یہ ان کے لیے مقدر نہ تھا، کیوں کہ ۱۹۳۹ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

جلد دوم (خب-سز)

اپنی حیات میں پروفیسر ونسنک جلد دوم کی صرف چار فصلیں (۸،۹،۱۰،۱۱) شائع کر سکے تھے۔ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کی لائبریری میں فصل ۸ اور فصل ۱۰ کے سرورق محفوظ ہیں۔فصل ۸ (خب-خمر،ص ا-۸۰) پر سنۂ اشاعت ۱۹۳۷ء اور فصل ۱۰ (دوم-رحم، ص ۱۶۱،۲۴۰) پر ۱۹۳۸ء درج ہے۔ونسنک کی وفات کے بعد معجم کی تحریر وتسوید کے کام کی نگرانی ڈاکٹر جے۔پی منسنگ

> اس پروجکٹ میں مشہور مصری محقق اور دانش ور محمد فؤاد عبد الباقی کا عملی تعاون بہت اہم اور غیر معمولی ہے۔موصوف متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔المعجم المفهرس لالفاظ القرآن الکریم کے نام سے قرآن کا انڈکس ان کا قابل قدر اور لائق ستائش کار نامہ ہے۔انھوں نے ونسنک کی کتاب A Hand book of early Muhammadan Tradition 'مفتاح کنوز السنة' کے نام سے عربی میں ترجمہ کیا ہے۔

(J.P.Mensing) کے سر آگئی۔موصوف سنوک اور ونسنک کے شاگرد ہیں۔'فقہ حنبلی میں حدود' (طبع لیدن ۱۹۳۶ء) کے موضوع پر انھوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔پھر ۱۹۳۸ء میں لیدن یونی ورسٹی میں جدید عربی کے استاد مقرر ہوئے۔۱۹۴۰ء میں اس پروجکٹ کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد تین برس کے عرصے میں انھوں نے جلد دوم کی مزید تین فصول (۱۲،۱۳،۱۴) شائع کیں۔اس کے بعد ۱۹۴۳ء میں وہ دوسری جلد مکمل کر کے شائع کرنے میں کام یاب ہو گئے۔اس طرح جلد دوم کی اشاعت دو محققین کی کاوشوں کی مرہونِ منت ہے۔اس کی ابتدائی چار فصلوں ('ز' تک) ونسنک کی تیار کردہ تھیں، جب کہ آخری تین فصلیں منسنگ نے تیار کی تھیں۔اسی لیے اس جلد کے ٹائٹل پر دونوں کا نام یوں درج ہے:

”رتّبه و نظّمه لفیف من المستشرقین، و نشره الدکتور أ۔ی۔ونسک أستاذ العربیة بجامعة لیدن و الدکتور ی۔ب۔منسج محاضر العربیة بجامعه لیدن۔“

اس جلد پر ڈاکٹر منسنگ کے دو پیش لفظ ہیں: ایک پر نومبر ۱۹۴۱ء اور دوسرے پر جولائی ۱۹۴۳ء کی تاریخ درج ہے۔اس

میں انھوں نے اپنے پیش رو پروفیسر ونسنک کی طرح وعدہ کیا کہ وہ الگ سے ایک مضمون لکھیں گے، جس میں اس پروجیکٹ کی تفصیلات بیان کریں گے اور یہ بھی ذکر کریں گے کہ معجم کی تالیف کا خیال (پروفیسر ونسنک کے) ذہن میں کیسے آیا؟ اور یہ پروجیکٹ کن مراحل سے گزرا؟ لیکن انھیں بھی اس کی توفیق نہ مل سکی۔ ۱۹۵۱ء میں ایک مرض میں مبتلا ہو کر وہ اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔ اس وقت وہ اقوام متحدہ کی جانب سے ایک مہم پر لیبیا میں تھے۔

جلد سوم (سنم۔طعم)

ڈاکٹر منسنگ نے لیبیا جانے سے قبل اس پروجکٹ پر کام جاری رکھنے کی ذمہ داری ہالینڈ کے دو نوجوانوں: ہاس (W.D.De Haas) اور وان لون (J.B.Vanloon) کو سونپ دی تھی۔ ان دونوں نے ۱۹۵۴ء تک کام جاری رکھا۔ لیکن جلد دوم کی اشاعت پر دس برس کا عرصہ گزر جانے کے باوجود جلد سوم مکمل شائع نہ ہوسکی، البتہ اس کی فصول شائع ہوتی رہیں۔ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی کی لائبریری میں فصل ۱۸؍ اور فصل ۲۰؍ کے سرورق محفوظ ہیں۔ ان کے مطابق فصل ۱۸؍ کی اشاعت ۱۹۵۲ء اور فصل ۲۰؍ کی ۱۹۵۴ء میں ہوئی۔ فصل ۱۸؍ کے ٹائٹل کور پر چار مرتبین کے نام درج ہیں: ی۔ پ۔ منسنج (J.P.Mensing)، و۔ پ۔ دی۔ ہاس (De Haas.W.P)، ی۔ ب۔ فن لون (Van Loon.J.B) اور ک۔ ادریانسی (C.Adriaanse)، جب کہ فصل ۲۰ کے سرورق پر منسنگ کا نام نہیں ہے، بقیہ تینوں نام ہیں۔

فصل ۲۱؍ کی اشاعت کے بعد تیسری جلد مکمل ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر وٹ کام نے لکھا ہے:

"اس جلد کو شائع کرنے کا سہرا J.T.P.Bruyin اور H.C.Ruyter کے سر جاتا ہے۔"

اس جلد کی اشاعت میں ڈاکٹر سی۔ سی برگ (C.C.Berg) کی دل چسپی اور معاونت کو بڑا دخل تھا۔ موصوف لیدن یونی ورسٹی میں جاوی زبان کے استاد اور رائل اکیڈمی امسترڈام (Royal Academy Amsterdam) کے چیرمین تھے۔ ان کی وجہ سے معجم کے طباعتی مصارف کے لیے ہالینڈ اور دیگر ممالک کی بعض تنظیموں اور اداروں کی جانب سے مالی تعاون ملا۔ ڈاکٹر برگ ہی کی بدولت یہ پروجکٹ دشوار گزار مرحلہ طے کرسکا۔

اپنے پیش لفظ میں ڈاکٹر برگ نے اس جلد کی ترتیب و اشاعت کے مراحل پر روشنی ڈالی ہے اور معاونین کا شکریہ ادا کیا ہے۔

جلد چہارم (طعن۔غمر)

جلد چہارم کی تیاری اور اشاعت کا کام ڈاکٹر ہاس، ڈاکٹر لون اور ڈاکٹر بروین نے انجام دیا۔ یہ جلد بھی سات فصول (۲۲۔۲۸) پر مشتمل ہے۔ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی کی لائبریری میں اس کی آخری فصل ۲۸؍ کا سرورق محفوظ ہے۔ اس پر انہی تینوں محققین کے نام درج ہیں اور مکمل جلد کی اشاعت کے وقت اس کے ٹائٹل پر بھی انہی حضرات کا نام ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخری مرحلے میں یہ پروجکٹ ڈاکٹر جے۔ بی۔ بروخمان (J.B.Brugman) کی زیر نگرانی آگیا تھا۔ کیوں کہ اس پر انہی کا پیش لفظ (تاریخ نومبر ۱۹۶۲ء) موجود ہے۔ موصوف ۱۹۶۱ء میں لیدن یونی ورسٹی میں عربی زبان کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ انھوں

سنت اور صاحب سنت

نے اس پروجکٹ میں کام کرنے والے طلبہ اور اساتذہ کی ایک ٹیم تیار کرلی اوران کے تعاون سے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

جلد پنجم تا جلد ہفتم

بقیہ جلدیں (پنجم، ششم، ہفتم) مکمل ڈاکٹر بروخمان کی زیر نگرانی شائع ہوئیں۔ جلد پنجم ۱۹۶۵ء میں، جلد ششم ۱۹۶۷ء میں اور جلد ہفتم ۱۹۶۹ء میں منظر عام پر آئی۔ جلد پنجم اور جلد ششم میں کوئی پیش لفظ نہیں ہے، البتہ جلد ہفتم میں ڈاکٹر بروخمان کے قلم سے نصف صفحہ کا مختصر پیش لفظ موجود ہے۔

مجلس مشاورت

معجم کی ابتدائی دو جلدوں میں اراکین مجلس مشاورت کے نام شائع ہوئے تھے۔ جلد اول میں درج ذیل نام ہیں:

1. M.M.Anesaki	(Tokio)
2. BajrakTarevis	(Beograd)
3. M.Foud Abdel Baky	(Cairo)
4. Jorga	(Bucarest)
5. Kratchkovsky	(Leningrad)
6. Lopez	(Lisbonne)
7. Marcais	(Paris)
8. Moberg	(Lund)
9. Nallino	(Rome)
10. Nicholson	(Cambridge)
11. Pedersen	(Copenhague)
12. Kuzicka	(Prague)
13. Schencke	(Oslo)
14. Tallquist	(Helsingfors)
15. Torrey	(New Haven)

جلد دوم کی فہرست میں ایک نام (Nallino(Rome) (نمبر شمار ۹) نکال دیا گیا۔ جلد دوم کی فصل ۲۰ر میں بھی چودہ نام ہیں۔ بقیہ جلدوں میں اس پوری فہرست کو حذف کر دیا گیا ہے۔ البتہ جلد چہارم کی آخری فصل ۲۸ر کے سرورق کے اندرونی صفحہ پر مجلس مشاورت کے Director of Bureau کی حیثیت سے J.Brugman کا نام درج ہے۔

علمی معاونین

اس پروجکٹ میں مشہور مصری محقق اور دانش ور محمد فؤاد عبد الباقی کا عملی تعاون بہت اہم اور غیر معمولی ہے۔ موصوف متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم کے نام سے قرآن کا انڈکس ان کا قابل قدر اور لائق ستائش کارنامہ ہے۔ انھوں نے ونسنک کی کتاب A Hand book of early Muhammadan Tradition کا 'مفتاح کنوز السنۃ' کے نام سے عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ (طبع قاہرہ، ۱۹۳۴ء) زیر تعارف معجم کے سلسلے میں انھوں نے متعدد پہلوؤں سے تعاون کیا ہے۔ ان کا ایک تعاون یہ ہے کہ انھوں نے حدیث نبوی کی متعدد بنیادی کتابوں، مثلاً صحیح مسلم، سنن ابن ماجہ اور مؤطا مالک کے محقق ایڈیشن شائع کیے اور ان میں احادیث کے نمبر ڈالنے میں ان نمبروں کی رعایت کی جو ونسنک نے اپنی معجم میں درج کیے تھے۔ ان کا دوسرا تعاون یہ ہے کہ انھوں نے اس معجم اور ونسنک کی دوسری کتاب 'مفتاح کنوز السنۃ' سے صحیح طریقے سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک کتاب تصنیف کی، جس کا نام ہے: 'تیسیر المنفعة بکتابی مفتاح کنوز السنة وا لمعجم المفهرس لالفاظ الحديث النبوی' (طبع قاہرہ ۱۹۳۵ء۔ ۱۹۳۹ء) ونسنک کی ان دونوں کتابوں میں چوں کہ مصادر حدیث کے غیر محقق اور غیر مرقّم نسخوں پر انحصار کیا گیا ہے، اس لیے ابواب و احادیث کے حوالوں میں کہیں کہیں ایک دو نمبروں میں فرق ہو جاتا ہے۔ فؤاد عبد الباقی نے تفصیلی جدول تیار کیے، تاکہ ان کتابوں کے حوالوں تک بآسانی رسائی ہو سکے۔

اس کے علاوہ خود اس معجم کی تیاری کے دوران بھی انھوں نے تعاون کیا ہے اور مرتبین کو وقتاً فوقتاً اپنے مشوروں سے نوازا ہے۔ ان کا نام مجلس مشاورت میں شامل تھا اور جلد سوم اور جلد چہارم (اسی طرح فصل ۱۸، ۲۰، ۲۸) کے سرورق پر ان جلدوں میں ان کی مشارکت کی صراحت موجود ہے۔ ڈاکٹر وڑکام نے ان کے تعاون کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے:

> ''انھوں نے معجم کے مرتبین کا ہمیشہ تعاون کیا اور سنت نبوی کے بارے میں اپنی وسیع معلومات سے انھیں مستفید کیا۔ انھوں نے متعدد مواقع پر اور خاص طور سے پروجکٹ کے نصف اول میں ترتیب و تدوین کے اہم اور بنیادی مسائل میں مرتبین کو انتہائی قیمتی مشوروں سے نوازا۔''

دوسرے اہم معاون ڈاکٹر جون بول (G.H.A Juynboll) ہیں۔ انھوں نے اس پروجکٹ میں ۱۹۶۱ء سے پروفیسر بروخمان کے ساتھ کام کرنا شروع کیا، جب کہ اس وقت وہ شعبۂ اسلامیات میں طالب علم تھے۔ اس کام میں ان کی دل چسپی اور انہماک اس حد تک بڑھا کہ آئندہ زندگی میں انھوں نے حدیث نبوی کو اپنی علمی تحقیقات کا خاص موضوع بنا لیا۔

ڈاکٹر وڑکام نے لکھا ہے:

''فصول کی اشاعت کے وقت ان کے سرورق کے اندرونی صفحہ پر علمی معاونین کے نام لکھے جاتے ہیں، مگر افسوس ہے کہ مکمل جلد کی تجلید (جلد سازی) کے وقت وہ اوراق ضائع ہو گئے۔''

مقام شکر ہے کہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی میں موجود معجم کی جلدوں میں ایسے چار سرورق محفوظ ہیں جن میں معاونین کے نام درج ہیں۔ فصل ۳ر کے سرورق پر ۳۷، فصل ۸ر کے ٹائٹل پر ۳۹، فصل ۲۰ر کے سرورق پر ۴۳ اور فصل ۲۸ر کے سرورق پر ۴۵ معاونین کے نام ہیں۔

مکمل جلدوں کی اشاعت کے وقت، جلد اول کے آخر میں ۳۸ر اور جلد دوم کے آخر میں ۴۲ر معاونین کی فہرست دی گئی ہے۔ جلد پنجم میں یہ تعداد ۵۱ر تک پہنچ گئی ہے۔ جلد ۳، ۴، ۶ اور ۷ میں فہرست معاونین موجود نہیں ہے۔

ڈاکٹر وڑکام نے لکھا ہے کہ پروفیسر ونسنک نے ۱۹۲۲ء میں اس پروجکٹ کی ایک رپورٹ تیار کی تھی، جس میں معاونین کی ایک فہرست دی تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ان کی مراد پروجکٹ میں صرف علمی تعاون کرنے والے نہ تھے، بلکہ اس میں انہوں نے ان لوگوں کا بھی نام درج کر دیا تھا جنہوں نے کسی بھی حیثیت سے اس میں تعاون کرنے کا وعدہ کیا تھا، یا اس پروجکٹ کے سلسلے میں اپنی تائیدی رائے پیش کی تھی۔''

ڈاکٹر وڑکام نے اس پروجکٹ کے عملی معاونین کی ایک جامع فہرست تیار کی ہے۔ اس میں ان کی تعداد چونسٹھ تک پہنچ گئی ہے۔ (اس فہرست میں خود ڈاکٹر وڑکام اور ڈاکٹر راون (جنہوں نے فہارس کی جلد نمبر ۸ر تیار کی ہے، کے نام بھی شامل ہیں) یہ فہرست درج ذیل ہے:

1.MUHAMMAD FU'AD ABD AL-BAQI
2. C.ADRIAANSE
3. C.VAN ARENDONK
4. R.BELL
5. C.C.BERG
6. E.J.VAN DEN BERG
7. W.B.JORKMAN
8. S.A.BONEBAKKER
9. G.BOS
10. J.BRUGMAN
11. J.T.P.DE BRUYN
12. J.ROBERTSON BUCHANAN
13. V.F.BUCHNER
14. A.A.CENSE
15. R.F.CHISOLM
16. A.A.FOKKER
17. H.FUCHS
18. J.FUCK
19. E.GOBEE
20. A.GUILLAUME
21. W.P.DE HAAS
22. W.HEFFENING

23. W.HENNING
24. M.HIDAYAT HOSAIN
25. T.P.HOFSTEE
26. J.HOROVITZ
27. A.J.W. HUISMAN
28. T.HUITEMA
29. MME.J.JANSE
30. B.JOEL
31. G.H.A.JUYNBOLL
32. W.KERN
33. A.KERSTEN
34. H.KINDERMANN
35. I.KRATCHKOVSKY
36. F.KRENKOW
37. L.B.KRETZSCHMAR
38. MME.R.KRUK
39. J.B.VAN LOON
40. A.MANSUR
41. J.P.M.MENSING
42. E.VAN MOURIKBROEKMAN
43. R.PARET
44. J.PEDERSEN
45. W.RAVEN
46. A.RICHTER
47. MME M.TH. ROMIJN
48.H.C.RUYTER
49. A.SARLOUIS
50. A.SCHAADE
51. D.W. SCHAAFSMA
52. A. SIDDIQI
53.P.SMOOR
54. J.L.SWELLENGREBEL
55. F.TAOUTEL
56. MOHAMED TAHTAH
57. A.S.TRITTON
58. MME.V.VACCA-DE BOSIS
59. P.VOORHOEVE
60. M.WEISWEILER
61.A.J.WENSINCK
62. W.D.VAN WIJNGAARDEN
63. H.A.WINKLER
64. J.J.WITKAM

مالی تعاون

ڈاکٹر وٹکام نے لکھا ہے کہ ''اس پروجکٹ میں علمی تعاون کرنے والوں کے معاوضہ اور طباعت کے مصارف ہالینڈی تنظیم برائے فروغ تحقیق علمی NETHERLANDS ORGANISATION

Netherlands Organisation
for Scientific Research

FOR THE DEVELOPMENT OF SCIENTIFIC RESEARCH نے برداشت کیے۔
اس سلسلے میں ابتدائی دو جلدوں میں کوئی صراحت نہیں ملتی، لیکن جلد ۳؍ سے جلد ۷؍ تک ہر جلد کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے:

”والمساعدات المالية هي من المجامع العلمية البريطانية والدنيمركية والسويدية والهولندية والانيسكو والمجلس الأممي للفلسفة والآداب والهيئة الهولندية للبحث العلمي البحث والا تحادالأممي للمجامع العلمية۔“

معجم کی کمپوزنگ اور طباعت کا کام دو اداروں کے تعاون سے انجام پایا۔ جلد چہارم کے صفحہ نمبر ۳۲۰؍ تک (یعنی معجم کا تقریباً نصف حصہ) لیدن کے مطبع بریل (E.J.BRILL) میں کمپوز اور طبع کیا گیا۔ بقول ڈاکٹر وٹکام ”اس مطبع میں کام کرنے والوں کو عربی زبان سے زیادہ واقفیت نہیں تھی، اس لیے انہیں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔“ چوتھی جلد کے بقیہ حصہ اور دیگر جلدوں کی کمپوزنگ اور طباعت کا شرف ہندوستان کو حاصل ہوا۔ یہ کام الدار القیمۃ بھیونڈی میں ہوا۔ اس کے مالک شیخ عبدالصمد شرف الدین (م ۱۹۹۶ء؍ ۱۴۱۶ھ) نے اس میں غیر معمولی دل چسپی لی اور بڑے اہتمام سے اسے طبع کرایا۔ ڈاکٹر وٹکام نے لکھا ہے:

”آخری چار جلدوں کی کمپوزنگ اور طباعت کا کام ناشرین نے الدار القیمۃ بھیونڈی (ہندوستان) سے کروایا۔ وہاں کے لوگ اور خاص کر اس ادارہ کے ڈائرکٹر عالم و متقی جناب عبدالصمد شرف الدین اپنے علمی سرمایہ سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے بڑی باریکی اور دل چسپی سے یہ کام انجام دیا اور بہت سے اضافات اور تصحیحات کیں۔ ان کی وجہ سے یقیناً معجم کی اشاعت بہتر ڈھنگ سے ہوسکی۔“

اس سلسلے میں جلد ۵؍ اور جلد ۶؍ کے آخر میں یہ صراحت ملتی ہے:

"Arabic Text has Printed by Ad-Darul- Qayiimah, Bhiwandi-India"

آخری جلد (فهارس)

جلد ہفتم کی اشاعت کے ساتھ یہ پروجکٹ مکمل ہوگیا تھا۔ اس کے آغاز ہی سے اس کے تحت اعلام و اماکن کے اشاریوں سے زیادہ دل چسپی کا اظہار نہیں کیا گیا تھا۔ ونسنک اور ان کے معاونین کے پیش نظر صرف معجم کی تیاری تھی۔ ونسنک نے اپنے ایک مقالے (شائع شدہ ۱۹۲۲ء) میں اشارہ کیا تھا کہ انہوں نے 'فہارس' کی تیاری اور اشاعت کو کسی آئندہ مرحلے کے لیے مؤخر کر دیا ہے۔ اسی لیے پروفیسر برخمان نے فہارس کے بغیر اس پروجکٹ کو ختم کرنے کا ارادہ کرلیا۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۶۹ء میں جلد ہفتم کی اشاعت کے فوراً بعد اس کا دفتر بند کر دیا اور معاونین و مرتبین سے کیے گئے معاہدوں کو منسوخ کر دیا۔
بعد میں ڈاکٹر جے۔ جے۔ وٹکام (J.J.Witkam) نے معجم کے ساتھ فہارس کی اہمیت محسوس کی اور ان پر مشتمل مزید ایک جلد

شائع کرنے کا ارادہ کیا۔اس کے لیے انہوں نے ۱۹۷۲ء میں معجم کی ترتیب میں کام آنے والے پرانے کارڈس (جن پر دھول جم گئی تھی اور وہ فراموش کر دیے گئے تھے) کا جائزہ لیا۔انہوں نے پایا کہ پیش نظر مقصد کے لیے یہ مواد کافی نہیں ہے۔اس لیے انہوں نے فہارس کی تیاری کے لیے از سر نو کام کا آغاز کیا۔ ۱۹۷۴ء میں وہ لیدن یونی ورسٹی کی لائبریری میں مشرقی مخطوطات کے شعبہ کے انچارج بنا دیے گئے۔اس وقت تک وہ صحاح ستہ اور سنن الدارمی کا بالاستیعاب مطالعہ کرکے اعلام، جغرافیائی اسماء اور قرآنی شواہد کی فہارس تیار کر چکے تھے۔

اشاریہ سازی کا بقیہ کام ڈاکٹر وم راون (Wim Raven) نے سنبھالا۔ امسترڈام یونی ورسٹی (University of Amsterdam) میں منصب تدریس پر فائز ہونے کے بعد بھی وہ اسے انجام دیتے رہے۔انہوں نے موطا مالک اور مسند احمد سے فہرستیں تیار کیں۔اس کام سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے اپنے اور ڈاکٹر وٹکام دونوں کے کام پر نظر ثانی کی اور تمام فہرستوں کو حروف تہجی کی ترتیب سے تیار کیا۔

اس آخری جلد (فہارس) کی اشاعت ہالینڈی تنظیم برائے فروغ علمی تحقیق اور Royal Academy Amsterdam کے فیاضانہ مالی تعاون کی بدولت ممکن ہو سکی ہے۔

پرنٹنگ ٹکنالوجی میں انقلاب آجانے کی وجہ سے اس کی کمپوزنگ اور طباعت مطبع دار بریل (E.J.BRILL) میں ہوئی، جہاں نصف صدی قبل اس کی جلد اول طبع ہوئی تھی۔

معجم میں مصادرِ حدیث کے اشارے

اس معجم میں حوالہ دینے کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ مصادر حدیث کے مختصر اشاراتی نام ذکر کرنے کے بعد کتاب کا مختصر نام پھر باب کا نمبر تحریر کیا گیا۔سوائے صحیح مسلم، موطا مالک اور مسند احمد کے۔صحیح مسلم اور موطا مالک کے ذیل میں (باب کا نمبر دینے کے بجائے) حدیث نمبر درج کیا گیا ہے، جب کہ مسند احمد کے حوالہ میں جلد نمبر اور صفحہ نمبر ذکر کیا گیا ہے۔مثلاً

خ شرکۃ ۱۶	سے مراد صحیح بخاری، کتاب الشرکۃ، باب نمبر ۱۶؍ ہے۔
م فضائل الصحابۃ ۱۶۵	سے مراد صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، حدیث نمبر ۱۶۵؍ ہے۔
د طہارۃ ۷۲	سے مراد سنن ابی داؤد، کتاب الطہارۃ، باب نمبر ۷۲؍ ہے۔
ت ادب ۱۵	سے مراد جامع ترمذی، ابواب الادب، باب نمبر ۱۵؍ ہے۔
ن صیام ۷۸	سے مراد سنن النسائی، کتاب الصیام، باب نمبر ۷۸؍ ہے۔
جہ تجارات ۳۱	سے مراد سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات، باب نمبر ۳۱؍ ہے۔

دی صلاۃ ۷۹ سے مراد سنن الدارمی، کتاب الصلاۃ، باب نمبر ۷۹ / ہے۔
ط صفۃ النبی ۳ سے مراد موطا مالک، صفۃ النبی، حدیث نمبر ۳ / ہے۔
حم ۴، ۱۷۵ سے مراد مسند احمد، جلد چہارم، صفحہ نمبر ۱۷۵ / ہے۔

جن نمبروں پر ستارہ کی علامت ☆ بنائی گئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نمبر کے باب، حدیث یا صفحہ پر وہ لفظ ایک سے زائد بار آیا ہے۔

معجم کی ترتیب کے دوران پیش نظر رہنے والے مصادر حدیث کے ایڈیشن

معجم کی ترتیب کے دوران مصادر حدیث کے درج ذیل ایڈیشن مرتبین کے پیش نظر رہے ہیں:

صحیح بخاری:

(۱) طبع قاہرہ، ۱۳۴۵ھ، ۹ جلدیں۔
(۲) تحقیق Juynboll/l.Krehl.T.H.W طبع لیدن ۱۸۶۲ـ ۱۹۰۸ء، ۴ جلدیں۔

صحیح مسلم:

(۱) تحقیق محمد فواد عبدالباقی طبع قاہرہ، ۱۳۷۴ـ ۱۳۷۵ھ / ۱۹۵۵ـ ۱۹۵۶ء، ۵ جلدیں۔

سنن ابی داؤد:

(۱) باہتمام محمد محی الدین عبدالحمید طبع قاہرہ، بدون تاریخ (۱۹۳۵ء کے آس پاس) ۴ جلدیں۔
(۲) محمود محمد خطاب السبکی، المنہل العذب المورود شرح سنن ابی داؤد، طبع قاہرہ، ۱۳۵۱ـ ۱۳۵۳ھ، ۱۰ جلدیں۔
(۳) امین محمود خطاب، فتح الملک المعبود تکملۃ المنہل العذب المورود طبع قاہرہ، ۱۳۷۵ـ ۱۳۷۹ھ / ۱۹۵۵ـ ۱۹۵۹ء، ۳ جلدیں۔

جامع ترمذی:

(۱) شرح الامام ابن العربی المالکی طبع قاہرہ، ۱۳۵۰ـ ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۱ـ ۱۹۳۴ء، ۱۳ جلدیں۔

سنن النسائی:

(۲) شرح جلال الدین السیوطی، باہتمام شیخ حسن محمد المسعودی، طبع قاہرہ، بدون تاریخ، ۸ جلدیں۔

سنن ابن ماجه:

(۱) تحقیق محمد فواد عبدالباقی، طبع قاہرہ، ۱۳۷۲۔۷۳ھ/ ۱۹۵۲۔۱۹۵۳ء، ۲ جلدیں۔

سنن الدارمی:

(۱) طبع کان پور (ہندوستان) ۱۲۹۳ھ

(۲) مطبع دار احیاء السنۃ النبویۃ، طبع بیروت، بدون تاریخ، ۲ جلدیں۔

موطا مالک:

(۱) تحقیق محمد فواد عبدالباقی، طبع قاہرہ، ۱۳۷۰ھ/ ۱۹۵۱ء، ۲ جلدیں۔

مسند احمد:

(۱) طبع قاہرہ، ۱۳۱۳ھ/ ۱۸۹۵ء، ۶ جلدیں۔

(۲) تحقیق احمد محمد شاکر، طبع قاہرہ، ۱۳۶۸۔۷۵ھ/ ۱۹۴۹۔۱۹۵۶ء، ۱۵ جلدیں نامکمل (اس ایڈیشن سے استفادہ کیا گیا ہے لیکن حوالہ صرف قدیم ایڈیشن کا دیا گیا ہے)

اس کتاب کی صورت میں مستشرقین کی برسوں کی علمی کاوش کا جو ثمرہ سامنے آیا ہے اس پر وہ علمی و دینی حلقوں کی جانب سے از حد شکریہ کے مستحق ہیں۔ لیکن اس سے استفادہ اور اس سے متعلق رائے قائم کرنے میں احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

فہارس کے مشتملات

آٹھویں جلد، جو فہارس پر مشتمل ہے، بہت اہم ہے۔ اس میں بنیادی طور پر تین فہرستیں پیش کی گئی ہیں:

(۱) اعلام کے اسماء

(۲) جغرافیائی اسماء

(۳) قرآنی سورتوں اور آیات کے اسماء

اسماء اعلام کے مشتملات درج ذیل ہیں:

۱۔ سند کا آخری راوی (عموماً صحابی)

۲۔وہ حضرات جن کے نام متون احادیث میں آئے ہیں۔

۳۔قوموں،قبیلوں اور ان کی شاخوں،قبائلی اور مذہبی گروہوں کے نام

۴۔ملائکہ،جن،شیاطین،بتوں،حیوانات،اور تلواروں کے نام۔اسی طرح ہر وہ چیز جس کا کوئی مخصوص نام ہو۔

۵۔اشخاص یا گروہوں کی جانب منسوب صفات۔

اعلام کے سلسلے میں دو باتوں کا تذکرہ ضروری ہے:

(الف):اعلام کی فہرست تیار کرنے میں ایک دشواری یہ تھی کہ حدیث کی مختلف کتابوں میں ایک ہی شخص کا تذکرہ مختلف ناموں کے ساتھ مختلف مقامات پر آیا ہے۔اس اختلاف کو باقی رکھتے ہوئے اشاریہ سازی مفید نہیں تھی۔اس لیے مرتبین نے طے کیا کہ ایک شخص کے مختلف ناموں کی تحقیق کر کے انہیں صرف ایک جگہ ذکر کیا جائے اور دیگر ناموں کی جگہ اسی کا حوالہ دے دیا جائے۔مثلاً:

-محمد بن مسلم بن شہاب الزہری

-ابن شہاب (ملاحظہ کیجیے محمد بن مسلم بن شہاب الزہری)

-زہری (ملاحظہ کیجیے محمد بن مسلم بن شہاب الزہری)

اعلام کا اشاریہ کس طرح تیار کیا گیا ہے؟اس سلسلے میں دیگر ضروری معلومات مرتبین نے شروع میں ذکر کر دی ہیں۔

(ب):اسانید میں مذکور اعلام کا اشاریہ نہیں تیار کیا گیا ہے،اس لیے کہ بقول مرتبین علم اسماء الرجال کا ایک بہت وسیع میدان ہے اور اسانید میں مذکور اسماء اور متون حدیث میں مذکور اسماء کے درمیان خلط ملط کرنا مناسب نہیں ہے۔احادیث کے تجزیاتی مطالعہ کے لیے اسانید میں مذکور اسماء کا مطالعہ نہایت ضروری ہے،لیکن یہ کام اس قسم کی سادہ فہرست میں ممکن نہیں ہے،اس لیے کہ اس میں روایتی طرز پر فہرستیں تیار کرنے کے بجائے الواح تیار کرنا ضروری ہے۔امید ہے کہ آئندہ اسلامیات کے میدان میں کام کرنے والے حضرات یہ کام انجام دیں گے۔اس میدان میں کمپیوٹر سے مدد لینا ضروری ہے۔

جغرافیائی اسماء میں درج ذیل چیزیں شامل ہیں:

۱۔اماکن و بلدان

۲۔پہاڑ،سمندر،دریا،چشمے

۳۔اجرام سماوی

۴۔غیر انسانی مظاہر،مثلاً زبانیں،لباس وغیرہ کی جانب منسوب صفات

فہرست اسماء و آیات قرآنی کو حروف تہجی کی ترتیب سے تیار کیا گیا ہے۔

فہرست شواہد قرآنی:یہ ان آیات قرآنی کا اشاریہ ہے جو متون احادیث میں بطور شواہد وارد ہوئی ہیں۔اس فہرست کو مصحف کی ترتیب سے تیار کیا گیا ہے اور پوری آیت ذکر کرنے کے بجائے صرف اس کا نمبر درج کر دیا گیا ہے۔

خاتمہ

اس کتاب کی صورت میں مستشرقین کی برسوں کی علمی کاوش کا جو ثمرہ سامنے آیا ہے اس پر وہ علمی و دینی حلقوں کی جانب سے از حد شکریہ کے مستحق ہیں۔لیکن اس سے استفادہ اور اس سے متعلق رائے قائم کرنے میں احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔کوئی بھی انسانی کام خامیوں سے بالکلیہ مبرا نہیں ہوسکتا اور خاص طور سے وہ کام جس کی انجام دہی میں مختلف مزاجوں اور صلاحیتوں کے افراد شریک رہے ہوں۔شروع میں ذکر کیا گیا کہ کتاب کا حجم محدود رکھنے کے مقصد سے مرتبین نے بہت سے ایسے الفاظ کو، جو احادیث میں کثرت سے آئے ہیں، حذف کر دیا ہے۔اس لیے اگر کسی حدیث کا کوئی لفظ اس کتاب میں نہ ملے تو قطعی طور سے یہ فیصلہ کر لینا مناسب نہ ہوگا کہ وہ حدیث مذکورہ نو کتب حدیث میں (جن کی اس کتاب میں اشاریہ سازی کی گئی ہے) موجود نہیں ہے۔اسی طرح اگر کسی حدیث کا حوالہ اس کے کسی ایک لفظ کے تحت نہ ملے تو اس کے دوسرے الفاظ کے تحت اسے تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

...

متفرقات

دارالمعارف الاسلامیہ، الہ آباد کی لائبریری

شاہ اجمل فاروق ندوی

دارالمعارف، الہ آباد ایک درمیانی سطح کا دینی ادارہ ہے، لیکن شریعت وطریقت کی یک جائی نے اِسے ایک منفرد مقام عطا کر دیا ہے۔ اپریل ۲۰۲۵م میں ادارے کے سرپرست اور مرکز ومحور شیخ طریقت مولانا شاہ محمد قمر الزماں الہ آبادی کی خدمتِ مبارکہ میں حاضری ہوئی تو پہلی مرتبہ ادارے کی لائبریری دیکھنے کا موقع ملا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوئی کہ شیخ طریقت کو کتابوں سے بڑا تعلق ہے۔ اس تعلق کا ایک مظہر وہ کتابیں اور تراجم بھی ہیں جو انھوں نے خود تصنیف فرما کر دنیائے علم کو عطا کیں یا دوسروں سے لکھوا

> ایک مجلس میں فرمایا: ”جب یہ مکتبہ بنا تو بات چل رہی تھی کہ اس کا کیا نظام رکھا جائے۔ ایک مسلمان نے کہا کہ اس میں تالا لگا رہنا چاہیے، ورنہ کتابیں چوری ہو جائیں گی۔ لیکن وہیں ایک ہندو بھی کھڑا تھا جو غالباً کتابوں کے کام سے وابستہ تھا، اس نے کہا کہ نہیں یہاں ہرگز تالا نہ لگائیے گا، بلکہ سب لوگوں کو پڑھنے کی عام اجازت دیجیے گا۔ سال میں ایک دو کتابیں چوری ہو سکتی ہیں، لیکن تالا لگانے سے نہ جانے کتنے لوگ محروم ہو جائیں گے۔“

کرا اپنے ہاں سے شائع کرائی ہیں۔ شاید ہی ان کی کوئی مجلس کسی کتاب یا صاحبِ علم کے تذکرے سے خالی ہوتی ہو۔ عمر کی نو دہائیاں عبور کرنے کے باوجود وہ کسی کے ہاتھ میں کوئی کتاب دیکھ کر بے چین ہو جاتے ہیں۔ اپنے دستِ مبارک میں لے کر دیکھتے ہیں اور سامنے والے سے بھی اس کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں۔ خود بھی تصنیف وتالیف کا عمل جاری رکھے ہوئے ہیں اور اہلِ علم کی ایک ٹیم کو بھی ترجمہ وتالیف کے کاموں میں لگائے ہوئے ہیں۔

زندگی کے جس مرحلے میں لوگ بستر پکڑ لیتے ہیں، اس مرحلے میں بھی شیخ طریقت مولانا شاہ محمد قمر الزماں الہ آبادی کا معمول یہ ہے کہ اپنے ذاتی وروحانی معمولات کے ساتھ روزانہ عشا بعد کچھ دیر مدرسے کی لائبریری میں ضرور تشریف فرما ہوتے ہیں۔ کتابوں کی کشش اکثر 'کچھ دیر' کو 'کافی دیر' میں تبدیل کر دیتی ہے۔ کچھ کتابوں کو نکلوا کر دیکھتے ہیں۔ ان پر گفتگو فرماتے ہیں۔ کسی کتاب پر اپنا لکھا ہوا کوئی حاشیہ وغیرہ مل جاتا ہے تو ساٹھ ستر سال پہلے کی یادوں میں کھو جاتے ہیں۔ جو لوگ جمع ہوتے ہیں ان کو بھی دنیائے علم کی سیر کراتے ہیں۔ اس درمیان کتابوں کو ہاتھ میں لے کر دیکھتے ہوئے ان کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی بشاشت دیدنی ہوتی ہے۔ کتاب کی باتوں اور یادوں میں کافی دیر گزر جاتی ہے تو اہلِ خانہ یا خدام مجلس ختم کرنے کی گزارش کرتے ہیں۔ اس پر بھی اکثر یہی ہوتا ہے کہ حضرتِ والا 'کچھ دیر اور' کا فرمان جاری کر کے بارشِ علم میں نہانے اور نہلانے کا مزید وقت نکال لیتے ہیں۔ میرا احساس ہے کہ

دنیائے طریقت سے وابستہ موجودہ بڑی شخصیات میں علمی ذوق کی ایسی کوئی دوسری مثال مشکل ہی سے مل سکے گی:

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

اس سے پہلے کہ مکتبہ دارالمعارف کی ایک جھلک دکھلائی جائے، اس مکتبے کے متعلق کچھ ایسی باتیں بیان کرنا ضروری ہیں، جو شیخ طریقت مولانا شاہ محمد قمر الزماں الہ آبادی نے میرے استفسار پر یا کسی اور وجہ سے بیان فرمائیں۔

خدا جھوٹ نہ بلوائے اس لائبریری کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں یہ وسوسہ آیا تھا کہ اس مکتبے کا نام مکتبہ الشیخ قمر الزماں کیوں ہے؟ یہاں تو سب سے بڑی شخصیت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری کی رہی ہے۔ ان کے نام پر یہ مکتبہ ہونا چاہیے تھا۔ اپنے اس وسوسے پر متنبہ ہوا اور میں نے اس وسوسے کو ختم کرنے کا علاج یہی سوچا کہ اس اشکال کو شیخ طریقت کے سامنے ہی رکھ دینا چاہیے۔ مغرب بعد حاضر ہوا اور دریافت کرلیا۔ ایک تو یہ وسوسہ آنا ہی غلط تھا، اوپر سے اگر میں یہ پوچھنے کی غلطی کر بیٹھتا کہ اس مکتبے کا نام آپ کے نام پر کیوں ہے؟ تو یہ بڑی بے وقوفی ہوتی۔ اس لیے میں نے یہ دریافت کیا کہ ”حضرت! کیا اس مکتبے میں اکثر کتابیں حضرت شاہ وصی اللہ صاحب کی ہیں؟“ حضرتِ والا نے فوراً فرمایا: ”نہیں، ان کتابوں کا حضرت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سب میری ذاتی کتابیں ہیں جو میں نے وقف کر دی ہیں۔ پھر ہدیہ بھی آتی رہیں اور خریدی بھی گئیں۔“ اس جواب سے میری وسوسے دانی کا سر بھی کچل گیا اور اس قیمتی لائبریری کے وجود میں آنے کی تاریخ بھی معلوم ہوگئی۔

یہ حضرت کی ذاتی لائبریری ہے۔ اس میں قدیم و جدید سب کتابیں ہیں۔ انھیں حضرت نے مدرسے کے لیے وقف کر دیا۔ لہٰذا اس لائبریری کو انھیں کے نام پر ہونا چاہیے تھا۔

ایک دن عشاء بعد بڑی بشاشت کے ساتھ فرمایا: ”روزانہ رات میں کتابوں کے درمیان آ کر بیٹھ جاتا ہوں تو ایمان تازہ ہوجاتا ہے۔“

ایک دن فرمانے لگے: ”ان کتابوں کو الحمدللہ بڑے بڑے علماء نے بھی دیکھا ہے۔ حضرت مولانا رابع حسنی صاحب اور مولانا واضح رشید صاحب بھی یہاں تشریف لائے تھے، تو مولانا رابع صاحب نے فرمایا تھا کہ علمی ضرورت پوری کرنے کے لیے یہ کتب خانہ کافی ہے۔“

ایک مجلس میں فرمایا: ''جب یہ مکتبہ بنا تو بات چل رہی تھی کہ اس کا کیا نظام رکھا جائے۔ایک مسلمان نے کہا کہ اس میں تالا لگا رہنا چاہیے، ورنہ کتابیں چوری ہو جائیں گی۔لیکن وہیں ایک ہندو بھی کھڑا تھا جو غالباً کتابوں کے کام سے وابستہ تھا،اس نے کہا کہ نہیں یہاں ہرگز تالا نہ لگائیے گا، بلکہ سب لوگوں کو پڑھنے کی عام اجازت دیجیے گا۔سال میں ایک دو کتابیں چوری ہو سکتی ہیں،لیکن تالا لگانے سے نہ جانے کتنے لوگ محروم ہو جائیں گے۔''

ایک مجلس میں ارشاد فرمایا: ''ہمارے حضرت کو کتابوں کے مطالعے کا بہت ذوق تھا۔ڈاکٹر کے منع کرنے کے باوجود رات میں بار بار اُٹھتے تھے اور مطالعہ کرتے تھے۔اپنے ذاتی کتب خانے کا ذمے دار مجھے ہی بنا رکھا تھا۔وہاں کی کتابوں پر میں نے ہی کاغذ چڑھایا۔دھوپ بھی میں ہی دکھاتا تھا۔دورانِ گفتگو مجھے معلوم ہوتا تھا کہ حضرت کو کب کون سی کتاب چاہیے۔جب حضرت ممبئی میں تھے اور میں یہاں تھا تو کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ انھوں نے کسی کتاب کے بارے میں معلوم کیا۔جب کوئی نہ بتا سکا تو فرمایا کہ قمر الزمان ہوتے تو بتا دیتے۔''

ایک بہت نصیحت آموز واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''ایک مرتبہ حضرت کے یہاں مولانا فخر صاحب کے ہاں سے کتابیں آرہی تھیں تو حضرت نے مجھ سے فرمایا تھا کہ جانتے ہو وہاں سے کتابیں کیوں آرہی ہیں؟ کیوں کہ وہاں کوئی پڑھنے والا نہیں رہا۔یہاں پڑھنے والے نہ رہیں گے تو یہاں سے بھی کتابیں چلی جائیں گی۔اس لیے پڑھنے والے پیدا کرو۔''

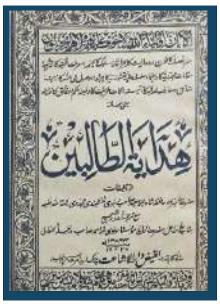

شیخِ طریقت مولانا شاہ محمد قمر الزماں الہ آبادی کے اسمِ گرامی سے منسوب دارالمعارف الاسلامیہ،الہ آباد کی یہ لائبریری دو کشادہ کمروں پر محیط ہے۔باہری کمرے میں دیواروں کے سہارے الماریاں کھڑی ہیں۔اور درمیانی حصے میں زمین پر بیٹھ کر پڑھنے کا اچھا نظم ہے۔اندرونی کمرہ زیادہ بڑا ہے۔اس میں چاروں طرف بھی اونچی الماریاں کھڑی ہیں اور درمیان میں بھی الماریوں کی دو صفیں کھڑی ہیں۔مجھے اس لائبریری کو اچھی طرح دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔اس لائبریری کو بہت بڑی لائبریری نہیں کہا جا سکتا اور ملک کے بڑے اداروں کی لائبریریوں کی صف میں نہیں رکھا جا سکتا۔اس کے باوجود یہ لائبریری ایک حیثیت سے منفرد مقام کی حامل ہے۔وہ یہ کہ تصوف کے بنیادی مصادر اور اہم کتابوں کے قدیم نسخوں کا جتنا بڑا ذخیرہ یہاں ہے،اتنا شاید ہی کہیں اور یکجا مل سکے۔بہت ساری کتابیں ایسی بھی ہیں جو ملک کی دوسری بڑی لائبریریوں میں بھی موجود نہیں ہوں گی۔اس لحاظ سے تصوف کی اہم کتابوں اور کتابوں کے قدیم نسخوں کا ذوق رکھنے والے اہلِ علم کو ایک بار اس خزانے کی زیارت ضرور کرنی چاہیے۔ان کتابوں کی

قیمت اس لیے بھی بڑھ گئی ہے کہ اکثر کتابوں کے ابتدائی صفحات یا اندرونی صفحات پر شیخ طریقت کے حواشی یا اشارے بھی موجود ہیں۔ اس سے کتابوں کے مغز تک رسائی میں بہت سہولت ہو جاتی ہے۔ تفصیل کا موقع تو نہیں لیکن جن کتابوں نے مجھے اپنی طرف زیادہ متوجہ کیا، ان کی فہرست نیچے درج ہے:

(۱) سیرت النبی (شبلی وسلیمان) کی اولین طباعت

(۲) بذل المجهود فی حل ابی داؤد کی قدیم طباعت

(۳) حصنِ حصین محشی، ۱۳۳۲ھ میں مطبع یوسفی لکھنؤ سے طبع شدہ

(۴) ترجمہ تاریخ ابن خلدون، ۱۹۲۷ء میں یونانی دواخانہ پریس الہ آباد سے طبع شدہ

(۵) التنبیۃ الطرفی فی تنزیہ ابن العربی، مولانا اشرف علی تھانوی، ۱۳۴۶ھ میں اشرف المطابع، تھانہ بھون سے طبع شدہ

(۶) جبر الکسر فی نظم أسماء اهل بدر، شیخ مصطفی رشدی دمشقی، ۱۳۴۱ھ میں مطبع مصطفی البابی، مصر سے طبع شدہ

(۷) فتح الملک المجید المؤلف لنفع العبید، شیخ احمد دیربی کبیر، حاشیے پر شیخ عبداللہ محمد سنوسی کی کتاب المجربات، ۱۳۴۳ھ میں مطبع مصطفی البابی، مصر سے طبع شدہ

(۸) تکمیل الیقین مع تعلیم الدین، مولانا اشرف علی تھانوی، ۱۳۲۱ھ میں بلالی دخانی پریس، انبالہ سے طبع شدہ

(۹) لطائفِ رشیدیہ، بلالی پریس، انبالہ سے ۱۳۱۸ھ میں طبع شدہ

(۱۰) مقالات الشیخ رشید رضا السیاسیة، دار ابن عربی

(۱۱) هدایة الطالبین، شاہ ابوسعید دہلوی مجددی، ۱۳۴۴ھ میں روز بازار پریس، امرتسر سے طبع شدہ

(۱۲) کنوز ریاض الصالحین، شیخ حمد بن ناصر العمار (۲۲ جلدیں)، دار کنوز اشبیلیہ

(۱۳) مسند ابو داؤد طیالسی مترجم، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ کراچی سے طبع شدہ

(۱۴) ذخیرۃ العقبیٰ فی شرح المجتبیٰ، شیخ محمد بن علی الاثیوبی (۴۲ جلدیں)

(۱۵) البحر المحیط الثجاج، شیخ محمد بن علی الاثیوبی (۴۵ جلدیں)

یہ وہ چند کتابیں ہیں جو اپنی دلچسپی کے لحاظ سے مجھے زیادہ پرکشش محسوس ہوئیں۔ میرے سفر کا مقصد لائبریری سے استفادہ نہیں تھا۔ اس لیے خاصا وقت دینے کے باوجود بھی تشنگی رہ گئی۔ یہ ذخیرۂ علمی اس بات کا متقاضی ہے کہ کچھ دن اس کے لیے وقف کر کے پڑھا جائے۔ تصوف کا ذوق رکھنے والوں کے لیے یہ علمی خزانہ بے نظیر ہے۔

...

سہ ماہی کتاب وسنّت

کے آن لائن مطالعے کے لیے اسکین کیجیے:

یا دیکھیے:

Website. www.kitabosunnat.in